

جاوسی دنیا نمبر 63

ادو فیضان

ڈاکٹر ڈریڈ

پُرسار آواز

گاڑی رکھنے کی آواز آئی۔ پہلوں کے نیچے روڑیاں کڑکڑائی تھیں اور شاید گھوڑا زمین پر ناپیں مارنے لگا تھا۔ شاہینہ نے کھڑکی کھول دی لیکن باہر پھیلے ہوئے اندر ہیرے میں اسے کچھ نہیں دکھائی دیا۔ اس نے نوکروں کو تاکید کر دی تھی کہ پورچ کی روشنی رات بھر گل نہ کی جائے۔ شاہینہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔ اس نے تھیہ کرایا تھا کہ آج وہ اپنی ماں سے لڑ جائے گی۔

کئی راتوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ بیگم ارشاد کافی رات گئے تک گھر سے باہر رہتی ہے اور کار کی بجائے گھوڑا گاڑی استعمال کی جاتی ہے۔ رات گئے تک گھر سے باہر رہنا بھی بیگم ارشاد کے لئے خلاف معمول تھا لیکن کار کی بجائے گھوڑا استعمال کرنا خاص طور پر حیرت انگیز تھا کیونکہ اس سے پہلے انہیں کبھی گھوڑا گاڑی استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دراصل شاہینہ ہی کو پسند تھی اور اکثر اس کی شام کی تفریح کے لئے استعمال میں رہا کرتی تھی۔

شاہینہ اپنے کمرے سے نگلی اور طویل راہداری سے گزرتی ہوئی بیر و فی برآمدے میں آگئی۔ کوئی پورچ سے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔ آسمان کے پس منظر میں اس کی پرچھائیں ہی نظر آرہی تھیں۔

”کون ہے؟“ شاہینہ نے کپکاتی ہوئی آواز میں پوچھا اور سایہ رک گیا۔

(چوتھا حصہ)

شایہنہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اور اب اسکی تشویش پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔
”جاوے سو جاؤ۔“ بیگم ارشاد نے پھر کہا اور شایہنہ اس کی پیشانی چوم کر کرے سے نکل آئی۔ وہ
باری کی روشنیاں گل کرتی ہوئی اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے پھر کچھ آہٹیں
خیں اور چلتے چلتے رک گئی۔

اُسے پھر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی صدر دروازے والی راہداری میں چل رہا ہو۔ شایہنہ
ندیورے میں خاموشی سے کھڑی رہی۔

قد مous کی آوازیں آنابند ہو گئیں۔ شایہنہ بھی صدر دروازے کی طرف بڑھی لیکن اس بار
نے راہداریاں نہیں روشن کیں۔ پورچ میں پھر اُسے ایک تاریک سایہ نظر آیا اور بیگم ارشاد
کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا شاید وہ اب بھی اُسی سیاہ لبادے میں لپی ہوئی تھی۔

شایہنہ دیوار سے گلی کھڑی رہی۔ سایہ پورچ سے نکل کر لان پر آگیا۔

اور پھر شایہنہ نے اُسے کپاونڈ کے اُس حصے کی طرف مرتے دیکھا جہاں پالتو جانوروں کے
نکھرے تھے۔ وہ بھی پورچ سے نکل آئی اور دیوار سے ٹک کر چلتے گئی۔ بار بار اُس کا لباس مالتی کی
جھاڑیوں سے الجھتا اور وہ رک جاتی۔

اُس نے اُس راستے کو اس لئے ترجیح دی تھی کہ بیگم ارشاد کی نظر اُس پر نہ پڑ سکے۔ قد آدم
جھاڑیوں کے دوسری طرف وہ بیگم ارشاد کو صاف دیکھ رہی تھی لیکن اگر بیگم ارشاد خاص طور پر
نے دیکھنے کی کوشش کرتی تو اسے اُس کے سر کے علاوہ اور پکھنے نظر آتا کیونکہ وہ مالتی کی بوڑھ
ل اوث میں تھی۔

جھاڑیوں کا سلسلہ جانوروں کے کٹھرے کے قریب میں تھم ہو گیا۔ دوسری طرف بیگم ارشاد
بھی رک گئی تھی۔

”بہت دیر کر دی۔“ شایہنہ نے کسی مرد کی آواز سنی۔ جملہ انگریزی میں کہا گیا تھا۔ تھوڑی دیر
تک کوئی آواز نہیں آئی۔ شایہنہ کا دل تبری طرح دھڑک رہا تھا۔

”یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔“ بیگم ارشاد کی آواز آئی۔

”تم اس پر مجبور ہو۔“ مرد نے کہا۔

جواب میں بیگم ارشاد کی آواز نہیں سنائی دی۔

”بولو.... خاموش کیوں ہو گئیں۔ کیا آج بھی کچھ نہیں ہو سکا؟“

”نہیں....!“ بیگم ارشاد کی آواز آئی۔

”کون ہے۔ جواب دو۔ ورنہ میں فائز کر دوں گی۔“

”شایہنہ۔“ اُس نے اپنی ماں کی بھراہی ہوئی نی آواز سنی۔

”کون.... میں.... آپ....!“

پر چھائیں اُس کے قریب سے گذرتی ہوئی راہداری کے اندر ہرے میں گم ہو گئی۔ شایہنہ اُس
کے پیچے بڑھی اور پھر ان کی ملاقات ایک روشن کرے میں ہوئی۔

بیگم ارشاد سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں لپی ہوئی تھی لیکن اُس نے شایہنہ سے آنکھیں
نہیں ملا میں۔ اُس کے ہونٹ خلک تھے اور چہرہ زرد نظر آرہا تھا۔

”میں مجھے حیرت ہے۔“ شایہنہ بڑھ بڑا۔

”اوہ.... میں دراصل۔“ بیگم ارشاد نے مکرانے کی کوشش کی۔ ”میں ایک ضروری کام
سے باہر گئی تھی۔“

”مگر آپ نے کبھی گھوڑا گاڑی نہیں استعمال کی۔“

”بس یو نہیں....!“

”میں کئی راتوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کافی رات گئے گھرو اپس آتی ہیں۔“

”جاوے... سو جاؤ۔“ بیگم ارشاد نے جلا کر کہا۔ ”تمہیں ان باتوں سے سروکار نہ ہونا چاہئے۔“

”اور آپ کو سروکار ہونا چاہئے۔ اگر میں نوبجے رات کو بھی گھرو اپس آؤں۔“

”جاوے.... لڑکی خدا کیلئے مجھے تہبا چھوڑ دو۔“

”میں آپ کو کئی دتوں سے پریشان دیکھ رہی ہوں۔“

”شایہنہ جاؤ.... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں۔“

”میں آپ مجھ سے کیا چھپا رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں چھپا۔“

”میں.... کچھ نہیں چھپا رہی ہوں میں بیٹھی! میں دراصل آج کل دل کی بیماری میں مبتلا ہو گئی
ہوں۔“ دفعٹا اُس کا چہرہ اس طرح معمول پر آگیا جیسے اُسے کوئی اچھا سا بہانہ ہاتھ آگیا ہو۔ پھر اُس

نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”مجھے اکثر گھر سے وحشت ہی ہونے لگتی ہے۔ میں گاڑی لے کر نکل
جاتی ہوں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہ کر ہٹکی اور بولی۔ ”تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ گاڑی بھی
میں خود ہی ہائکتی ہوں۔“

”لیکن آپ کسی ڈاکٹر سے کیوں نہیں رجوع کرتیں؟“

”یہ ایک وقتی ذہنی تبدیلی ہے۔ ویسے میں اچھی خاصی ہوں۔ مجھے ہوا کیا ہے۔“

"تب تو تمہارے بُرنے دن قریب آگئے ہیں۔"
”دیکھو۔ خدا کے لئے مجھے برباد نہ کرو۔“
”میں کیا کر سکتا ہوں۔ اپنی بربادی کا باعث تم خود بنوگی۔“
”میرے خدا میں کیا کروں!“

”وہی جو کہا جا رہا ہے۔“ مرد نے کہا۔ ”ورنہ تم دیکھ رہی ہو میری قوت۔۔۔ تم جیسی مالدار عورت شہر کی متعفن گلیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔“
”رحم کرو۔“ بیگم ارشاد گز گڑائی۔

”میں رحم بھی کر سکتا ہوں مگر اسی صورت میں جب میرے کہنے پر عمل کیا جائے۔ ویم اسے کبھی نہ پاسکوگی۔ اس خیال میں نہ رہو کہ وہ مر چکا ہے۔“
پھر سکوت طاری ہو گیا۔ شاہینہ کو اپنے دل کی دھڑکیں سر میں دھمکی محسوس ہو رہی تھیں۔
وہ اندر ہیرے میں آنکھیں چھاڑتی رہی لیکن اسے اپنی ماں کے غلاڈ اور کوئی نہ دھکائی دیا۔
پھر اس نے اسے بھی عمارت کی طرف واپس جاتے دیکھا۔ وہ چل گئی اور شاہینہ نے کچھ دری بعد صدر دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔
وہ دوپیں کھڑی رہی۔ اسے سخت حیرت تھی کہ وہ آدمی کون ہے۔ گفتگو انگریزی ہی میں ہوئی تھی اور اس کا لہجہ غیر ملکیوں کا ساختا۔

آخر وہ اس کی ماں کو اس طرح خوفزدہ کیوں کر رہا تھا اور وہ کس لئے اسے شہر کی متعفن گلیوں میں ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ بیگم ارشاد ایک مالدار یہو تھی۔ شہر کی ذی عزت ہستیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ وہ پارلیمنٹ کی مجرم بھی تھی۔ بیگم ارشاد ایم۔ پی سے شہر کا پچہ پچہ واقف تھا کیونکہ سماجی بہبود کے سارے کاموں کے سلسلے میں اس کا نام سرفہرست ہوا کرتا تھا۔
شاہینہ خیالات میں کھوئی کھڑی رہی۔ اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ صدر دروازہ اندر سے بند ہو جانے کے بعد اپنی خواب گاہ تک پہنچنے کے لئے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ویم اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس چلے جاتی جہاں اس کی ماں نے کھڑی ہو کر اس پر اسرار آدمی سے گفتگو کی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ عمارت کی طرف واپس ہوئی۔

خواب گاہ تک پہنچنے کے لئے اسے کافی جدوجہد کرنی پڑی کیونکہ کھڑکی زمین سے تقریباً پانچ فٹ اونچی تھی اور یہی غیمت تھا کہ وہ اسے کھلا چھوڑ آئی تھی۔ ورنہ یا تو اسے رات برآمدے میں برس کرنی پڑتی، یا پھر بیگم ارشاد کو معلوم ہو جاتا کہ اس نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

”برات بھر ٹھیک سے نہ سو سکی۔ بار بار اسے وہی واقعات یاد آتے اور ایک انجمنا ساخوف اُس دین پر مسلط ہوتا جاتا۔ وہ جانتی تھی کہ بیگم ارشاد اسے کچھ نہیں بتائے گی۔ اس لئے اُس کی تباہی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔“

دوسری صبح اُس نے کرامگ رپورٹر انپور کو فون کیا جس کی اُس سے اچھی خاصی جان پچھان نہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انور اکثر لوگوں کے لئے کام کرتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کسی اذن کی طرح محض ایک نظر دیکھ لینے کی فیس بھی وصول کر لیتا رہا ہو۔

شاہینہ نے اُس سے درخواست کی کہ وہ صرف پندرہ منٹ کے لئے ارشاد منزل آجائے لیکن

سے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ چار بجے شام کو اپنے فلیٹ میں مل سکتا ہے۔

شاہینہ کو اُس پر بڑا غصہ آیا لیکن خاموش ہی رہ گئی کیونکہ اُس سے ایک کام لینا تھا۔

شاہینہ ایک اڑا موڈرن قسم کی لڑکی تھی۔ سوسائٹی کی روح روایا۔ شاید ہی بھی کوئی اُس کی استعداد کر سکا ہو۔

چار بجے وہ انور کے فلیٹ میں جا پہنچی۔ وہ موجود تھا۔ اُس نے واقعات سے اور بُر اسامنہ بنا کر بولا۔ ”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ جوانی کے رومان عموماً بڑھاپے ہی میں آدمی کو شاعری رنے پر مجبور کرتے ہیں۔“

”کیا مطلب....؟“

”مطلب صاف ہے۔ بیگم ارشاد جیسی ارب پتی عورتوں کے لئے کس قسم کے مسائل الجھاوے پیدا کر سکتے ہیں۔ کسی قسم کے لوگ انہیں شہر کی گندی گلیوں میں ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ کیا وہ آدمی کوئی بیک میل نہیں ہو سکتا۔۔۔؟“

”یہی تو تمہیں معلوم کرنا ہے۔“

”پھر اس کے بعد؟“

”اُس کے خلاف قانونی کارروائی۔“

”یا بیگم ارشاد خود ہی کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتی؟“

”پتہ نہیں۔“

”میاں حسین گو نگہر لے باول کے نیچے مغز نہیں ہے؟“ انور نے طنزی مکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”تم لوگ جس قدر اپنے جسم کو سنوارتی ہو اُسی طرح ذہن کو بھی نکھارو تو کیا رہا ہے۔“
”میں کسی اسکول ماشر سے میڑک پاس کرنے کا نہ معلوم کرنے کے لئے نہیں آئی۔“

”میر اخیال ہے کہ ان دونوں پر شہر کیا جا سکتا ہے۔ مگر انہیں پسند نہیں کرتیں لیکن پھر
بھی کبھی ہمارے گھر آتے رہتے ہیں۔“

”میں اب نہیں پوچھوں گا وہ کون ہیں۔“ انور چھپلا گیا۔

”دو انگریز باب پیٹے۔ راجڑ کی ٹیل اور ہنڑ کی ٹیل۔ یہ دونوں ابھی حال ہی میں انگلینڈ
آئے ہیں اور مگر می سے یہاں کی صنعتوں میں اشتراک کرنا چاہتے ہیں۔“

”بیگم ارشاد انہیں ناپسند کیوں کرتی ہیں؟“

”وہ حقیقی ٹیل ہیں پر لے سرے کے گدھے۔“

”آپ ان کی آوازیں تو پچانتی ہی ہوں گی؟“

”میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔“

”میا پچھلی رات بولنے والا ان میں سے کوئی تھا؟“

”میں اندازہ نہیں کر سکی۔ مجھے دراصل ہوش ہی نہیں تھا۔“

”اگر بیگم ارشاد کو معلوم ہو گیا کہ میں ان کی ٹوہ میں ہوں تو وہ کیا کریں گی۔“

”کچھ بھی کریں لیکن اس سلسلے میں میر انعام نہ لیا جائے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ مجھے ان حالات سے لاعلم رکھنا چاہتی ہیں۔“

”اچھی بات ہے میں دیکھوں گا۔“

”پرسوں میری سالگرد ہے۔“ شاہینہ نے کہا۔ ”میں تمہیں مدعو کروں گی۔ اس بھیڑ میں
تمہیں کام کرنے کا بہترین موقع مل سکے گا۔“

انور چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”تم یہ تباو کے معاوضہ کیا لو گے؟“

”یہ ایک ہزار خرچ ہو جانے کے بعد ہی اندازہ کر سکوں گا۔“ انور نے میز پر پڑی ہوئی گذی
کی طرف اشارہ کیا۔

”تم آخر پیسوں پر اس بڑی طرح کیوں جان دیتے ہو؟“

”پیسے....!“ انور خندی سانس لے کر بولا۔ ”کیونکہ یہ مجھ تک غیر متوقع طور پر پہنچتے ہیں۔
آج صبح ہی میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے مالک مکان کی بیوی سے عشق کرنا ہی پڑے گا کیونکہ چار ماہ
سے قلیٹ کا کراہی نہیں ادا ہو سکا تھا۔“

شاہینہ بھی جھلا گئی۔

”تو جاؤ۔۔۔ تمہیں روکا ہے کسی نے۔“

”تم بہت مغور ہو گئے ہو۔“

”ہاں.... پہلے ہی سے تھا۔ میں اس وقت بھی مغور تھا جب اسی شہر میں اکثر میری راتیں
فٹ پا تھوں پر گذری ہیں۔ ویسے مجھے خوش رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے کچھ ایڈو فل
نکال کر سامنے والی میز پر رکھ دو پھر مجھ سے گفتگو کرو۔“

شاہینہ چند لمحے اسے تفری آمیز نظروں سے گھورتی رہی پھر بیگ سے نوٹوں کی ایک گذی
نکال کر میز پر پھیکتی ہوئی بولی۔ ”یہ ایک ہزار ہیں۔“

انور نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بھائی۔ ایک لڑکا کرے میں داخل ہوا اور انور نے اس سے
کہا۔ ”چائے۔“ پھر شاہینہ سے پوچھا۔ ”محترمہ آپ چائے مناسب سمجھیں گی یا کافی؟“

”کچھ بھی نہیں۔ مجھے زیادہ نہ چڑھاؤ۔ کام کی بات کرو۔“

انور نے لڑکے کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ عرض کر رہا تھا محترمہ کہ اگر بیگ
ارشاد اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکتیں تو انہیں شہر کی گندی گلیوں میں خود کریں کھانے
کی کیاضورت تھی۔“

”پھر کیا ہو سکے گا۔“

”یہ ممکن ہے کہ اس بیگ میل کو ان کے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن.... یہ ایک مشکل
کام ہے۔ اخراجات.... بے تحاشہ ہوں گے۔“

”پھر وہی اخراجات....!“ شاہینہ اسے گھونٹنے لگی۔

”اوہ.... مجھے اطمینان ہے۔ شاہینہ ارشاد مجھ سے گفتگو کر رہی ہیں۔ ہاں تو آپ کو یقین
ہے کہ وہ کوئی غیر ملکی تھا؟“

”لمحے سے ہی معلوم ہوتا تھا۔“

”انگریز؟“

”مجھے اس کا سلیمانیہ نہیں ہے۔ بس ملکی اور غیر ملکی لمحے میں فرق کر سکتی ہوں۔“

”خیر! بیگم ارشاد کے ملنے والوں میں کسی غیر ملکی سے واقف ہیں آپ؟“

”بہت کرے ہیں.... لیکن....!“ شاہینہ کچھ سوچنے لگی پھر بولا۔ ”لیکن وہ دونوں۔“

”کون دونوں؟“

تمہارے طبقے میں مرد ہوتے ہی کہاں ہیں۔

”انور....!“

”میں سن رہا ہوں۔“

”خدا کے لئے میری مدد کرو۔ مگر خطرے میں میں۔ میں استدعا کرتی ہوں۔“

انور نے نوٹوں کی گذی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ چند لمحے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر ستر کر بولا۔ ”جاو۔... کام شروع ہو چکا ہے۔ جلد ہی نتیجے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ ہاں مجھے اپنی

سماں لگرہ کے موقع پر مدد عکرنا مت بھولنا۔“

شایہ نے خاموش رہی وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

و حشت

کیپین حمید نے اپنی رفتار تیز کر دی مگر شاید وہ لڑکی چلاواہ تھی۔ اگلے ہی موڑ پر وہ اس طرح غائب ہوئی جیسے اُس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

حمدی نے ایک طویل سانس لی اور اس طرح سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جیسے اُس پر بہت برا ظلم ہوا ہو۔ وہ چند لمحے چورا ہے پر کھڑا رہا پھر مختلف صفت میں چل پڑا۔

لوگی کا تاقاب اُس کی آفاد طبع کا نتیجہ تھا۔ بلکہ یہ اُس کی ڈیوبٹی تھی۔ وہ آج تقریباً ایک چھٹے سے اُس لوگی کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ اُس سے مل بیٹھتا۔ اُس

نے آج تک اُس سے گفتگو بھی نہیں کی تھی۔ اس سلسلے میں فریدی کے سخت ترین آرڈر تھے۔ ورنہ شاید حمید اب تک سینکڑوں بار اسکے ساتھ شہر کی بہترین تفریح کا ہوں میں رقص کر چکا ہوتا۔

لوگی بڑی دلکش تھی لیکن حمید اب تک اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ کس ملک یا نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ ویسے اُس کی رنگت گوری تھی۔ آنکھیں سبز اور وہ یور و پیونوں کی طرح اسکرٹ پہنچتی تھی۔ حمید کا خیال تھا کہ اُس کی چال بھی بڑی دلکش ہے۔

ایک بات اور بھی پسند تھی وہ یہ کہ وہ لڑکی عام اور توں کی طرح نہ تولپ اسک استعمال کرتی تھی اور ورنہ اُس کے ناخ بڑھے ہوئے تھے۔ کبھی بھی رخساروں پر ہلاکار و ڈندر آتا تھا۔

حمید اُس کے متعلق سوچتا ہوا چلتا رہا۔ فریدی نے اس ”نگرانی“ کی غرض و غایت نہیں بتائی۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”میں آپ سے اس پر بحث نہیں کروں گا کیونکہ ابھی آپ سے مزید آمدی کی توقع ہے۔“

”تو تم آج سے کام شروع کر رہے ہو؟“

”اسی وقت سے.... اور یہ کام چند سوالات سے شروع ہو جائے گا۔ پہلا سوال۔ کیا یہ ارشاد کے کسی ایسے دوست کو آپ جانتی ہیں جو ان کے طبقے سے تعلق نہ رکھتا ہو؟“

”کیا مطلب....؟“

”مطلوب یہ کہ ایسا دوست جس کی تلاش میں وہ شہر کی گندی میوں میں ٹھوکریں کھانے پر بجور ہوں۔“

”میں سمجھتی ہوں تمہارا مطلب!“ شایہ نے غصیلے لمحے میں کہا۔ ”تم ہمارا ذائقہ اڑانا چاہتے ہو۔“

”میں صرف معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔“

”لیکن میرا یہ سوال تمہارے شبہات سے بہت قریب ہے کیوں؟“

”تم نے فرض کر لی ہے یہ بات؟“

”نہیں یہ حقیقت ہے۔ تم بھی وہی سوچتی ہو جو میرے ذہن میں ہے۔ ورنہ تم یہاں آنے کی بجائے ملجم سراغِ رسانی کے آفسر سے ملتیں۔“

شایہ نے کچھ نہ بولی۔ انور نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ ”جو انی کی لغزشیں اکثر بڑھاپے میں پھانکی کا پھنڈہ بن جاتی ہیں۔“

”تم بد تیز ہو۔“

”یقیناً! چونکہ تم سے مزید رقم ملنے کی توقع ہے اسلئے میں اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“

”نہیں۔ میں کوئی اور ذریعہ تلاش کروں گی ورنہ تم اسی طرح ہماری توبین کرتے رہو گے۔“

”شوق سے۔ روپے اٹھاؤ اور ہاستے سے تو واقف ہی ہو۔ اسی لئے میں نے انہیں ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ورنہ شاید میں وعدہ کر لیتا کہ توہین نہیں کروں گا۔“

”تم حکیجی کریک ہو۔“

”بات ختم ہو گئی۔ اس لئے اس خیال سے تھقین نہیں ہو سکوں گا۔ تم جا سکتی ہو۔“

”میں کہتی ہوں تمہیں یہ کام کرنا ہی ہو گا۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“

”چلتے چلاتے اتنی نصیحت ضرور کروں گا کہ آئندہ کسی مرد سے اس انداز میں گفتگو نہ کرنا۔“

تھی اور حمید کی معلومات ابھی تک اتنی ہی تھیں کہ وہ دشاد بندگ کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔ ایک مقامی فرم میں کام کرتی ہے اور اُس کا نام میری سٹھنیں تھا۔ جلوہ احباب کے متعلق حمید کا سہی اندازہ تھا کہ وہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔

ان چند باتوں کے علاوہ ابھی تک کچھ بھی نہیں معلوم کر سکا تھا۔ لیکن وہ لڑکی اُسے حقیقت پر اسرار معلوم ہوتی تھی۔

اور آج تو اُس نے کمال ہی کر دیا تھا۔ پتہ نہیں اُسے زمینِ نگل گئی تھی یادہ ہوا میں تخلیل ہو گئی تھی۔ حمید نے اُسے کسی عمارت میں بھی داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سونپنے لگا کہ اُسے علم ہو گیا ہے کہ اُس کی نگرانی ہو رہی ہے۔

آج کل فریدی پر ”نگرانیوں“ کا بھوت سوار تھا۔ وہ شہر کے تقریباً ڈیڑھ درجن افراد کی نگرانی کر رہا تھا۔ مگر حمید اُس کا شکر گذار تھا کہ وہ لڑکی اُس کے حصے میں آئی تھی اور نہ نگرانی سے زیادہ اکتادیے والا کام شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور پھر ایک پیلک ٹیلی فون بو تھے کی طرف بڑھا۔

کچھ دیر بعد وہ لیڈی انپکٹر ریکھا تے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ وہ گھر ہی پر ہو گی۔ اُس کا خیال غلط نہیں تھا۔ ریکھا تے گئی۔ اُس نے فریدی کے لبھ کی نقل کرتے ہوئے ریکھا تے کہا کہ وہ پندرہ منٹ کے اندر اندر آر لچوپ میں پہنچ جائے۔ ریکھا تے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ اُسے کیوں طلب کر رہا ہے۔

ٹیلی فون بو تھے سے نکل کر حمید نے ایک شیکی کی اور آر لچوپ آپنچا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اب ان ہو ٹلوں والی تفہیمات سے اکتا گیا تھا۔ مگر کرتا بھی کیا۔ کہاں جاتا۔

تفہیم اور لیڈی انپکٹر ریکھا کے ساتھ؟ یہ بھی ایک سوال تھا کیونکہ وہ آج کل حمید سے بڑی طرح خارکھائے ہوئے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فون کرتے وقت حمید کو فریدی کا رول اور کتنا پڑا تھا۔۔۔ وہ ایک ایسے گوشے میں بیٹھ کر اُس کا منتظر کرنے لگا جہاں داخل ہوتے ہی ریکھا کی نظر اُس پر نہ پڑ سکے۔

کچھ دیر بعد ریکھا صدر دروازے میں دکھائی دی۔ ہال کے وسط میں پہنچ کر وہ پھر رکی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی نظر حمید پر پڑی اور حمید نے کچھ اس طرح من پہنچ ریکھا کی جانب اُس کی موجودگی اُسے کھل گئی ہو۔

ریکھا ریکھنیش ہال کی طرف بڑھ گئی۔ حمید جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر ڈائینگ

ہا میں واپس آئی۔ چند لمحے کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر حمید کی میر کے قریب آکر بولی۔ ”کرنل ساحب کہاں ہیں؟“

”پتہ نہیں۔“ حمید نے خلاف موقع پر بھی سنجیدگی اور شرافت سے جواب دیا۔ ”میں آدھے عنصیر سے ان کا منتظر ہوں۔ انہوں نے فون پر کہا تھا کہ آر لچوپ میں ملو۔“

”مجھ سے بھی سیکی کہا تھا۔“ وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ غالباً سوچ رہی تھی کہ اُسی بیرون پہنچ جائے یا کوئی دوسرا جگہ منتخب کرے۔

”بیٹھو...!“ حمید نے کہا اور وہ غیر ارادی طور پر بیٹھ گئی۔

حمید خاموش ہی رہا اور اُس کے اس روئی کو ریکھا تھرست سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں کب فون کیا تھا؟“

”شاید آدھ گھنٹے پہلے کی بات ہے۔“

”میا حماقت ہے.... میں تو نگف آگیا ہوں اس ملازمت سے۔“

”مکن ہے کسی وجہ سے ہماری موجودگی یہاں ضروری ہو۔“

”ان ممکنات اور ناممکنات نے میری زندگی تلنگ کر کھی ہے۔“

”تو پھر تم استخفی کیوں نہیں دے دیتے؟“

”میا اُس کے بعد جان فتح سکے گی۔ قادر ہارڈ اسٹوڈنٹ مجھے زندہ رہنے دے گا؟“

”آج کل کیا چکر ہے؟“

”وہی پرانا چکر۔ کوئی ایسی لڑکی نہیں ملتی جو شادی کے لئے تیار نہ ہو۔“

”اب مجھے اٹھ جانا چاہئے۔“ ریکھا بر اسامنہ بنا کر بولی۔

”پھر تم نے چکر کے متعلق کیا پوچھا تھا؟“

”میرا تھرست تھا کہ آج کل کون سا کیس ہے تم لوگوں کے پاس؟“

”سوٹ کیس....!“ حمید بر اسامنہ بنا کر بولا۔ ”اور اُس میں بچو بھرے ہوئے ہیں۔ ریکھا کیا تم بھی بور نہیں ہو تیں؟“

”ہوتی ہوں۔ جب تم اوٹ پلینگ باٹیں کرنے لگتے ہو۔“

حمدایکی خشنڈی سافنس لے کر رہ گیا۔

ریکھا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”لیکن آج کل تم بہت بچھے بچھے سے نظر آ رہے ہو؟“

”تمہیں کیا... میں جنم میں جاؤں۔“

”کچھ بھی نہیں... ضرور جاؤ۔“

”دہاں بھی تمہارے لئے ٹھنڈی آئیں بھرتا ہوں گا۔“

”ضرور ضرور...!“ ریکھا مسکرا کی۔ ”کیا تم بھی ٹھنڈی آئیں بھرنا چاہتے ہو؟“

”اتی زیادہ کہ اگر بھی تمہاری سائکل کی ہواںکل جائے تو میرے پاس لانا۔“

”تم کب تک یہاں بیٹھو گے؟“

”جب تک کہ قادر ہارڈ اسٹون نہ آجائے۔“

”مگر میرے لئے یہ پہلا اتفاق ہے۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ تم دونوں روزانہ یہاں ملا کرتے ہو۔“

”پھر کتنے لگے۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ فریدی صاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ مجھے بلا کر خود غائب ہو جائیں۔“

”تمہیں فون کرنے کے بعد کوئی دوسرا مل گئی ہوگی۔“

”تم حدد درج بد تیز ہو۔“ ریکھا گزر گئی۔

”ذرا آہستہ بولو ورنہ آس پاس والے تمہیں کوئی بد مز من یوں سمجھ لیں گے اور میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ بھی تو شہر کی لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ کنوں بتے جائے گا کہاں۔“

”میں اب یہاں نہیں بیٹھوں گی۔“

”اس ضد پر جہاں بھی بیٹھو گی میرا جلوہ ہر حال میں قریب سے نظر آئے گا۔ لہذا مناسب ہے کہ میں بیٹھی رہو۔“

”تم گدھے ہو۔“

”بالکل....!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”میں نے آج تک اس کی تردید نہیں کی لیکن پھر بھی کوئی لڑکی مجھے اپنا شہر بنانا پسند نہیں کرتی۔“

”اس تذکرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”ہے کیوں نہیں۔ بینک بیلیس بھی ہے لیکن پھر بھی کوئی متوجہ نہیں ہوتی۔“

”اپنی شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں؟“

”صح شام دیکھتا ہوں لیکن اپنی پیشانی پر تمہارا نام لکھا ہوا آج تک نہیں دیکھا۔“

”میرا نام میری چیلوں کے تلووں سے سروں پر چھپتا ہے۔“

”سبحان اللہ! تو آج کل تم چھاپ خانہ ہو رہی ہو۔“

”اور آج کل تم ذہنی دیوالیہ پن کا شکار ہو رہے ہو۔“

”یہ بھی درست ہے۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ آج تم دو ایک راؤنڈ میرے ساتھ ناجزاو۔ درنہ ہو سکتا ہے کہ میری ذہنی موت آج ہی واقع ہو جائے۔“

”مجھے ان لغویات سے دلچسپی نہیں ہے بلکہ بھی آتی ہے ان گدوں پر جو ناچتے ہیں۔“

”اس کے باوجود بھی کرتل ہارڈ اسٹون کو تمہاری پرواہ نہیں ہو گی۔ اور... ہمپ....!“

”حید چوک کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ ریکھا بھی مڑی لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ حید چونکا یوں تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”یہ لڑکی انور کے ساتھ کیوں نظر آرہی ہے۔“ حمید بڑا بڑا۔

”کون لڑکی... ہاں ہے تو... مگر وہ کون ہے؟“

”ایک جوان اور خوبصورت لڑکی۔ ویسے بعض لڑکیاں بورڈھی بھی ہوتی ہیں اور بد صورت بھی۔“

”تم کوئی غصہ دلانے والی بات کہہ رہے تھے پھر پلٹ گئے۔“

”ہائے غصہ دلانے والی۔ تو وہی تذکرہ چھیروں۔ کرتل ہارڈ اسٹون والا۔“

”تم بیووے ہو۔“

”آخر مجھ میں کیا خرابی ہے؟“

”شت آپ...!“

”اڑے اگر وہ اس صدی کا سب سے بھیجی آدمی ہے تو میں آنے والی صدیوں کا مجیب ترین آدمی بھی ہو سکتا ہوں۔ مگر فی الحال اس تذکرے کو یہیں رہنے دو۔ آخر یہ شاہینہ انور کے ساتھ کیوں ہے۔“

”تمہارے ساتھ ہونا چاہئے اسے؟“

”لا ہول ولا قوتہ تمہاری موجودگی میں مجھے کوئی بورڈھی بکری بکھن پسند نہیں آسکتی۔“

”اگر میں نے تمہیں یہیں مردانہ لمحے میں گالیاں دینی شروع کیں تو کیا ہو گا۔“

”بڑے مردانہ انداز میں میرے ہاتھ چلیں گے۔ شروع ہو جاؤ۔“

”ریکھا انور اور شاہینہ کی طرف دیکھتی رہی۔ انور سیاہ سوٹ اور بے داغ سفید قمیض میں بڑا

شاہزاد لگ رہا تھا اور شاہینہ اگر مرد ہوتی تو یقینی طور پر اسے نمونیہ ہو گیا ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں؟

”حید بھی سوچ رہا تھا۔ اس نے ریکھا سے کہا۔ ”کیا یہ عورتیں انگارے کھاتی ہیں؟“

”کیوں؟“

”لکن شدید سردی ہے اور یہ شاہینہ ایک بالاشت کے بلاوز میں ہے۔ آدھا پیٹ کھلا ہوا ہے“
”تو کیا یہ لانگی آئی ہو گی۔“ ریکھا نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”اس کا کوٹ کلوک روم میں ہو گا“
”ارے تو کیا یہاں سردی نہیں ہے؟“
”ریکھا پکھ تسبیولی۔ حمید نے پکھ دیر بعد اس سے کہا۔ ”اگر آج تم میری ہم رقص نہ بنیں تو
انتقام برا بھیاں ہو گا۔“
ریکھا نے اس طرح گردن جھک دی جیسے کوئی پھر اس بے کا انوں کے قریب شام کیاں
الاپ رہا ہو۔

”تم نہیں سمجھتیں وہ انور کا پنجا مجھے بہت حقیر سمجھے گا۔ اگر ایک راؤٹ بھی اُس کبوتری کے
ساتھ ناج لیا۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”اچھی بات ہے میں تمہیں دلکھ لوں گا۔“

”اچھی ذریتی ہے۔“ ریکھا جھخڑا گئی۔ ”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“

حمید وہاں سے اخا اور نیزی سے چلتا ہوا ریکھا نے ہال میں آگیا۔ لیکن ابھی یہاں نہتا تھا۔
چچ بھائی سے ریکھا پر تاؤ آگیا تھا لہذا وہ اُسے جتابینا چاہتا تھا کہ آر لکھو میں اُس کا وقت بردا
کرنے والا وہ خود ہی تھا ظاہر ہے کہ یہ معلوم ہونے پر ریکھا بڑی طرح چراغ یا ہوتی۔

وہ پھر ڈینیگ ہال میں واپس آیا۔ ریکھا بھی شاید اٹھنے ہی کازادہ کر رہی تھی۔

”تو تم میری ہر قص نہیں بنو گی۔؟“

ریکھا کوئی جواب دیئے بغیر جانے کے لئے اٹھی۔

”بھر میں نے تمہیں کس لئے بلایا تھا؟“

”کیا مطلب....؟“ ریکھا اُسے گھورنے لگی۔

”میاں میں کرٹل کے لجھ کی نقل نہیں انتار سکتا۔“

”خدا تمہیں غارت کرے۔“ ریکھا ایک طویل سانس لے کر بیٹھ گئی۔

”اگر تم اسی لجھ میں بھی بیمیش بھجے گفتگو کرتی رہو تب بھی غیرمت ہے۔ تمہیں کیا پڑے کہ جب تم غصے کی حالت میں اپنا اور پری ہو ہونٹ سکوڑتی ہو تو میرے دل کی دنیا کس طرح سکرنا اور
چلنے لگتی ہے۔“

”لو ہوم....!“ ریکھا غصے کی زیادتی میں رو دینے کے سے انداز میں بوی۔

”ملوہ سمجھ کر مجھے زندہ رہنے دو۔“ حمید نے غم ناک لمحے میں کہا۔
ریکھا اپنا نچلا ہونٹ چاٹی رہی۔ حمید پھر بولا۔ ”آخر اس میں تمہارا انتقام کیا ہے۔ اگر کبھی
بھی مسکرا کر میری طرف بھی دیکھ لیا کرو۔“

”تم نے میرا وقت بردا کر لیا ہے۔“ ریکھا دانت پیس کر بولی۔

”اور تم میری زندگی بردا کر دینے پر تملی ہوئی ہو۔“ حمید نے پھر محضی سانس لی۔

”بکے جاؤ۔“

”مگر تم اٹھو گی نہیں۔“

”نہیں۔ آج یہاں کچھ ہو کر رہے گا۔“

”یعنی....!“

”بس دیکھ لینا۔ میں تمہارے ساتھ رقص کروں گی۔“

حمد خاموش ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ریکھا کہیں ویسی ہی کوئی حرکت نہ کر بیٹھے جیسی ایک بار
ہائی سر کل ناٹ کلب میں کرڈا تھی۔

”کیوں... دم نکل گیا۔“ دفتر ریکھا بھی پڑی۔

”اگر تم اسی طرح ہمیشہ ہستے رہنے کا وعدہ کرو تو میں اپنی گردن کاٹ کر نیشنل نیوزیم میں رکھ
سکتا ہوں۔“

”یہ لڑکی کون ہے؟“ ریکھا نے شاہینہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”شاہینہ... ارشاد نیگم کی لڑکی...!“

”اوہ.... اچھا ہے وہی شاہینہ ہے جس نے پچھلے سال بیٹھ منٹن کی ٹرانی جیتی تھی۔“

”ہاں یہ وہی شاہینہ ہے۔“

”اُس اور کے ساتھ دیکھ کر تم متھر کیوں ہوئے تھے؟“

”پکھ نہیں۔ اور اُس طبقے کا آدمی نہیں ہے جس سے وہ تعلق رکھتی ہے۔“

”تم بھی تو اُس طبقے کے آدمی نہیں ہو جس سے کرٹل فریدی کی طبقے کے آدمی نہیں ہیں۔ ویسے اگر تم انہیں کسی طبقے ہی میں رکھنا چاہتی
ہو تو ابھی تک اُس طبقے نے جنم ہی نہیں لیا۔“

حمد گفتگو تو ریکھا سے کر رہا تھا لیکن اُس کی نظر شاہینہ کی طرف تھی۔ اور کئی بار سکھیوں
سے اُس کی طرف دیکھ پکھا تھا لیکن پوری طرح متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ حمید ہی نے

نہیں! اتحاد میں آئی ہوئی ہر چیز مجھ پر بھیک رہی تھی۔
”دیکھو....!“ حمید نے انور سے کہا۔ ”یہ ہوش میں نہیں معلوم ہوتی۔ کیا تم نے اسے کہیں
پہنچا تھی؟“

”نہیں....!“ انور تشویش کن لمحے میں بولا۔ ”کیا یہ کپڑے بھی انثار پھیلنے گی؟“
شاہینہ دھیلوں کی طرح اچھل کو درہ تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور جسم پر صرف پیٹ
وٹ اور محمر رہ گئے تھے۔

حمید اور ریکھا

آر لچھو کا فنجیر بوكھلا یا ہوا چاروں طرف دوڑتا پھر رہا تھا۔ حمید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے
ہوئے کہا۔

”اس پر کسی قسم کا دورہ پڑا ہے۔“

”جی ہاں۔ جی ہاں۔ پھر بتائیے میں کیا کروں؟“

”ایک کمرہ خالی کر دیجئے۔ انور بولا۔ ”ورنہ دیکھنے آپ کا بُرنس....!“

”جی ہاں.... جی ہاں۔“ وہاں گلوں کی طرح بولا اور ایک طرف دوڑتا چل گیا۔

شاہینہ چلتگھاڑتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی اور اب دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ رہی تھی۔

”ہٹ جائیے۔ براہ کرم۔ ہٹ جائیے۔“ حمید مجھ کو ہٹانے لگا۔

لیکن بھلا اس کی کون سختا لوگ ائس پر پھینکیاں کرنے لگے اور پھر اس کی پیشانی پر تو
خیر نہیں تھا کہ وہ محکمہ سراغ رسانی کا کوئی آفسیر ہے۔ ہو سکتا ہے اس مجھ میں دو ایک اس کی
جان پچان کے بھی رہے ہوں۔ مجبور احید کو ہوٹل کا لاؤڈا پسکر استعمال کرنا پڑا۔

”خواتین و حضرات! براہ کرم آپ مریضہ کے پاس سے ہٹ جائیے۔“ اس کی آواز ہاں میں
گوئی۔ ان خاتون پر اعصابی دورے پڑتے ہیں.... بہت بہت شکریہ.... مگر باہمیں جانب ابھی
لک بھیڑ ہے براہ کرم آپ لوگ بھی ہٹ جائیے۔“

بدقت تمام وہ مجھ ہٹانے میں کامیاب ہوا۔ اتنی دیر میں تین ڈیوٹی کا نشیل بھی سڑک پر سے
اندر آگئے تھے اور شاہینہ اب فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ ریکھانے اس کا جسم اس کی

اُس کی پرواہ کی۔

”تم اسے نہی طرح گھور رہے ہو۔“ ریکھانے کہا۔

”ہاں مجھے اس پر غصہ آ رہا ہے۔ آخر یہ اپنی پیٹ کیوں دکھاتی پھر رہی ہے۔ کیا بد مذاق ہے۔
مجھے بڑی نفرت معلوم ہوتی ہے ایسی عورتوں سے جو اس قسم کے بلاوز استعمال کرتی ہیں۔ اگر میں
یہاں انگوٹی لگا کر رکھ آؤں تو سارے شہر میں شور ہو جائے گا۔ خیر مذاق چھوڑو سبیل گے
دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ جسم کا سب سے بھدا حصہ پیٹ ہی ہے۔“

”اب تم بے تکلی بکواس پر آتے۔ تمہاری کھوپڑی ہے یا سڑک کو نہیں کا جن؟“

حمداب بھی شاہینہ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُن کی میز پر کھانے پینے کی کچھ چیزوں تھیں اور
اس وقت وہ دونوں کافی پی رہے تھے۔ شاہینہ کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بات پر
بھجن گھانی ہو لیکن چونکہ اُن کی میزوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اس نے حمید اُن کی آوازیں
نہیں سن سکتا تھا۔ ویسے شاہینہ کے ہوٹ بہت تیزی سے ہل رہے تھے۔ ساتھ ہی آنکھیں کبھی
سکڑتی تھیں اور کبھی پھیل جاتی تھیں۔ انور اس طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کی باتیں
اُس کے لئے حیرت انگیز اور غیر متوقع رہی ہوں۔

پھر اچانک ”چنان“ کی آواز آئی اور حمید کی پلکیں ایک لحظہ کے لئے جھپک گئیں کیونکہ یہ
آواز اُس تھپڑ کی تھی جو انور کے گال پر پڑا تھا۔

انور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ اتنا تمیر تھا کہ پھر وہاں سے ہٹ بھی نہ سکا۔

شاہینہ حلق چھاڑ چھاڑ کر جیخ رہی تھی۔ ”ہاں سور کے بچے۔ میرے پانچ سو پچس شوہروں میں پھر
تھے مطلب۔ میں پانچ سو پچس شوہروں کی بیوی ہوں..... کتے..... پھر تھے کیا۔“ پھر وہ اپنے
کپڑے نوپنے لگی۔ خاصہ ہگامہ برپا ہو گیا۔ کر سیاں خالی ہونے لگیں۔ اُن دونوں کے گرد بھیز ہوتی
جاری تھی۔ شاہینہ اب بھی جیخ جیخ کر اپنے پانچ سو پچس شوہروں کا پرو دیگانہ کر رہی تھی۔
وہ غلط حمید نے انور کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھیز سے باہر کھینچ لیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”پتہ نہیں مجھے خود بھی حیرت ہے۔“ انور نے پر سکون لمحے میں جواب دیا۔ اس کے انداز
سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس واقعہ ہی سے بے تعاقب ہو اور ایک تماشائی سے زیادہ حیثیت نہ
رکھتا ہو۔

شاہینہ نے میز الٹ دی۔ مجھ پیچھے ہٹا۔ نہ صرف پیچھے ہٹا بلکہ کافی کی طرح پھٹنے لگا کیونکہ

سازھی سے ڈھانک دیا۔
پھر کچھ دیر بعد وہ اُسے ایک اسٹریچر پر اٹھا کر میجر کے خالی کرائے ہوئے کمرے میں لے گئے۔ شاہینہ اب بھی بے ہوش تھی۔ حمید نے ڈاکٹر کے لئے رنگ کیا اور پھر کمرے میں ریکھا، انہوں نے ہلاکت کے علاوہ کوئی نہ رہ گیا۔ حمید انور کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔
”پانچ سو پیچن شوہروں کا کیا حصہ تھا؟“ اُس نے پوچھا۔
”پتہ نہیں۔“

”تھپڑ مارنے سے قبل وہ کیا کہہ رہی تھی؟“
”یاد نہیں لیکن وہ گفتگو قطعی ہندیاں قسم کی تھی۔“
”کیا تم دونوں میں عرصہ سے دوستی ہے؟“
”مجھے یاد نہیں۔“
”تم زمین ہی پر ہونا؟“ حمید غرایا۔

”ہاں...!“ انور نے لاپرواں سے جواب دیا اور شاہینہ کی طرف دیکھنے لگا۔
”ریکھا...!“ حمید بولا۔ ”ڈاکٹر میں بیگم ارشاد کے نمبر دیکھ کر انہیں فون کر دو۔“
”تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔“ انور نے حمید کی طرف مڑے بغیر کہا۔
”میں ایک ذمہ دار آفیسر ہوں... ریکھا... جلدی کرو۔“
”خیاڑہ بھکٹا پڑے گا۔“ انور بڑا بڑا یا۔

”گٹ آؤٹ!“ حمید نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔
”یہ حوصلے ہیں۔“ انور اسے نیچے سے اوپر تک دیکھتا ہوا بولا۔
”میں تمہیں حرast میں لیتا ہوں۔“ حمید غرایا۔ ”تم مشیات کی تاجائز تجارت کرتے ہو۔ تم نے اس لڑکی کو چس پلائی تھی۔“

”بھنگ...!“ انور نے سکرا کر تھج کی۔
”ڈیوٹی کا نشیلوں کو اندر بلالو۔“ حمید نے ریکھا سے کہا۔ ریکھا باہر چلی گئی۔
”کیوں شامت آئی ہے۔“ انور حمید کو گھورنے لگا۔
”شٹ آپ...!“

”اچھا...!“ انور ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں شاید حوالات تک بھی نہ پہنچ سکوں لیکن اس کے بعد...!“

جلدہ پورا ہونے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور ڈیوٹی کا نشیل اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے حمید سیوٹ کیا۔

”اس آدمی کو اپنی نگرانی میں رکھو۔“ حمید نے انور کی طرف اشارہ کیا۔
”چلے صاحب۔“ ایک کا نشیل نے انور کو مخاطب کر کے کہا۔ لیکن ٹھیک اُسی وقت کمرے کا دروازہ اس انداز میں کھلا جیسے کوئی سر کش نشیل اندر گھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر آنے والی بیگم بیٹھا تھی۔ اُس کے چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔

”میری بچی۔“ اُس نے تھج مار کر بے ہوش شاہینہ پر گرنا چاہا۔
”ٹھہریے محترمہ...!“ حمید نے اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ جھلانے ہوئے انداز میں حمید کی طرف مڑی۔

”تم کرامر پورٹر انور ہو؟“ اُس نے تقریباً تھج کر پوچھا۔
”نہیں... کیپشن حمید فرام اٹھیل جنس یوریو۔“

”اوہ...!“ بیگم ارشاد خوفزدہ نظر آنے لگی۔ حمید نے انور کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”یہ کرامر پورٹر انور ہے۔“

”تم میری بچی کو برپا د کر رہے ہو۔“ بیگم ارشاد نے دانت پیس کر کہا۔
”یہ میرے لئے بالکل نئی اطلاع ہے بیگم ارشاد۔ لیکن آپ مجھے پچانتی بھی نہیں ہیں۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”تم اسے مشیات کا عادی بنا رہے ہو۔“
”مگر آپ کو اس واقعہ کی اطلاع کیسے ہوئی بیگم ارشاد۔“ انور نے طنزیہ لمحے میں کہا۔
”ہو گئی کسی طرح۔“ اگر تم نے شاہینہ کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں تمہارے خلاف کوئی سخت ترین کاروائی کروں گی۔“

انور نے لاپرواں کے اظہار میں اپنے شانوں کو جنمیں دی اور حمید بول پڑا۔
”یقیناً... یقیناً بیگم ارشاد۔ میں اس شخص کو مشیات کی تاجائز تجارت کے سلسلے میں گرفدار کر رہا ہوں۔ ابھی اس کی جیب سے کوئیں کا ایک پیکٹ برآمد کیا گیا ہے۔“ پھر اُس نے کا نشیلوں سے کہا۔ ”لے جاؤ۔“

انور چپ چاپ ان کے ساتھ چلا گیا۔
”میں آپ کی مشکور ہوں جتاب۔“ بیگم ارشاد حمید سے کہہ رہی تھی۔

”اب میں اسے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اس سلسلے میں بھی میری مدد کریں گے؟“
”ضرور... ضرور...!“
”میں ہمیشہ احسان مندر ہوں گی۔“
”انور کے خلاف اور کیا کارروائی کی جائے؟“
”اوہ... بس میں یہ چاہتی ہوں کہ وہ میری بیٹی سے نہ ملا کرے۔“

”میں اسے اچھی طرح سمجھادیں گا۔ آپ مطمئن رہئے۔ لیکن میں نے ڈاکٹر کو بولوایا ہے۔“
”بیکار ہے کیپشن حمید“ بیگم ارشاد بڑی بڑی۔ ”یہ کسی قسم کا مرض نہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ
اس سورنے اسے کسی نئے کاغذی بنا لایا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔ اچھی بات ہے۔ بیگم ارشاد کیا آپ اپنی گاڑی لائی ہیں؟“
”جی ہاں... میری گاڑی کپاڑتھ میں موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ حمید نے کہا اور پھر ریکھا سے بولا۔ ”بیگم ارشاد کا ہاتھ بنائیے مس ریکھا۔“
ریکھا اور بیگم ارشاد نے بیویش لڑکی کو اٹھا کر اسٹرپپر ڈالا اور دو کاشیبلوں کی مدد سے وہ بیگم
ارشد کی کار تک پہنچا دی گئی۔

”حید اور ریکھا پھر اندر واپس آئے۔ بیگم ارشاد انہیں ڈاکٹر کے لئے فیس دے لئی تھی۔“
”اب تم لوگ جاسکتے ہو۔“ حمید نے کاشیبلوں سے کہا۔ ”سب ٹھیک ہے۔“
انہوں نے انور کی طرف دیکھا اور حمید پھر بولا۔ ”میں دیکھ لوں گا۔ تم لوگ جاؤ۔“ کاشیبل
چلے گئے۔

”کیوں دم نکل گیا۔“ انور کے ہونوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ تھی۔
”ہاں نکل گیا۔ اب تم بھی دفعہ ہو جاؤ۔“

”میرا نام انور ہے... آزر یہ کیپشن حمید۔“
”میں کب کہتا ہوں کہ تمہارا نام چھلا دیوی ہے... دو غلے لینڈی ڈاگ۔“
”بوٹیاں نوجوانی۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ریکھا اس دوران میں انہیں حرمت سے دیکھتی رہی
تھی۔ انور کے چلے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ”تمہارا ویہ اس سلسلے میں شروع ہی سے غیر متوقع
رہا تھا۔“

”اوہ... چھوڑو... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے گلاب کی چکھڑیوں جیسے
لیکن جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی آر لکھو کا میر جنگی ٹکلیں...!“

”یہ سب کیا ہو گیا... کپتان صاحب۔“
”بیٹھئے... یہ بتانا تو مشکل ہے... لیکن...!“
”میرا خیال ہے کہ وہ بھنگ پیئے ہوئے تھی۔“
”ممکن ہے۔“

”آر لکھو کار پوپ میشن بُری طرح خراب ہو رہا ہے۔“ میرجھ متفکرانہ لجھ میں بولا۔ ”یہاں
یعنی دن اونچے طبقے کے لوگ بالکل لو فروں کے سے انداز میں ہڑ بونگ مچاتے ہیں۔ ابھی کچھ ہی
ان پہلے یہاں ایک بڑے آدمی نے دوسرے بڑے آدمی پر شوربے کی پلیٹ کھینچ ماری تھی۔ اور
یک لڑکی کا انخواع ہو گیا تھا۔“

”ہاں واقعی یہ بہت بُری بات ہے۔“

”پھر بتائیے میں کیا کروں۔ اگر یہی حالت رہی تو کچھ دنوں بعد یہاں آلو بولنے لگیں گے۔“
”آپ باہر ایک بورڈ لگواد بیجے جس پر تحریر ہو۔ براہ کرم خواتین بھنگ پی کر تشریف نہ لائیں۔“
”میرجھ بہنے لا گا پھر سنجیدگی سے بولا۔“ اپری طبقہ اخلاقی حیثیت سے بالکل دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے۔
”تب تو پھر آپ اسی عمارت میں اخلاقیات کا ایک اسکول قائم کر دیجئے۔“

”کپتان صاحب ایں سنجیدگی سے آپ کا مشورہ چاہتا ہوں۔“

”سنجیدگی سے مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں شراب کے ساتھ ہی ساتھ بھنگ بھی فروخت
کریا کریجئے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس قسم کے ہنگاے کوئی وقعت نہ رکھیں گے ورنہ آپ
ان عورتوں کو توروک ہی نہ سکیں گے جو باہر سے بھنگ پی کر یہاں آتی ہیں۔“

”میرجھ کچھ نہ بولا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔“

”تم آج کچھ عجیب لگ رہے ہو۔“ ریکھا مسکرا کر بولی۔

”اور عجیب آدمیوں پر لڑکیاں بُری طرح مرتی ہیں... ہااا... یہ بھی عجیب لطیف ہے۔ ان
سے پوچھو کر تم اس پر کیوں مرتی ہو جواب ملے گا وہ کچھ کھویا کھویا سارہتا ہے۔ انتہائی رومنیک
لیکن اگر اتقان سے انہیں کوئی کھویا کھویا سارہنے والا شہر مل گیا تو وہ سو فیصدی اکو کا پٹھا اور گاؤ دی
ہو گا۔ نہ وہ انہیں عجیب لگے گا اور نہ رومنیک۔ اسے وہ عکی اور جھکی کہیں گی۔“

”تم سے اتنی بکواس کرنے کو کس نے کہا تھا؟“

”ہاا... ریکھا! بس ختم کرو۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے گلاب کی چکھڑیوں جیسے
ہونٹ ہر وقت میرے ذہن میں چکراتے رہتے ہیں جب تم اپنی گھنیری ٹکلیں...!“

”شٹ اپ“

”ریکھا... اٹھو... رقص کے لئے موسیقی شروع ہو گئی ہے ایسے لمحات بار بار نہیں آتے۔ باہر یقینی طور پر چاندنی کھیت کر رہی ہو گی۔ ہوا میں جنگلگوار ہنوں گی اور چاندن بادلوں کے لکڑوں میں اپنے اباجان کے ساتھ آنکھ چھولی کھیل رہا ہو گا۔ اٹھو! گرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی۔“
”مجھے نیند آری ہے۔ میں اب گھر جاؤں گی۔ مگر شہر و یہ شاہینہ کا کیا قصہ تھا۔ تم انزو پر
بڑی طرح تاؤ کھا گئے تھے پھر اسے اتنی آسانی سے کیوں چلے جانے دیا۔“
”کچھ نہیں یونہی۔“ حمید نے لاپرواٹی سے کہا۔ ”ان سب پاتوں کا خاص مرے مود پر ہے۔“
”مگر نیگم ارشاد سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ انور کی حیب سے کوئی کاپیٹ برآمد ہوا ہے۔“
”زبان ہی تو ہلانی پڑی تھی۔ میرا کیا نقصان ہوا۔“

”لیکن اس نے تو اسے حقیقت ہی سمجھا تھا۔“

”مگر اس کے باوجود بھی وہ صرف اتنا ہی چاہتی ہے کہ انور اس کی لڑکی سے نہ ملا کرے۔ اس نے اس کے خلاف کسی قانونی کارروائی کا ارادہ نہیں ظاہر کیا تھا۔“

”ہاں یہ بات بھی عجیب ہے۔“

”پتہ نہیں عجیب ہے بھی یا نہیں۔ بہر حال میں اس سلسلے میں مغرب کھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ تم بھی خواہ جو خود کو بورنہ کرو۔“

”ریکھا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک ویژہ میز کے قریب آکر حمید سے بولا۔ ”آپکافون ہے جناب۔“
”اوہ.... اچھا!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

وہ فیجر کے کمرے میں چلا گیا۔ فیجر موجود نہیں تھا۔ شاید حمید کو اطلاع دلوانے کے بعد وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

”بیلو...!“

”حید...!“ دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔

”جی ہاں... فرمائیے۔“

”تمہارا دل اس سلسلے میں تسلی بخش رہا۔“

”آپ کیا جانتیں۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”تم اس قسم کے فضول سوال مجھ سے نہ کیا کرو۔“

”تو کیا آج کل پھر آپ نے اپنا جال سارے شہر میں پھیلار کھا ہے۔“

”سنو....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ریکھا کا پیچھا چھوڑو۔ اس وقت وہ لڑکی میں پول شما ایک آشرين کے ساتھ ناچ رہی ہے۔ اس وقت جو آدمی اُس کی گرفتاری کر رہا ہے اُس کے لئے موزوں نہیں ہے۔“

”لہذا میں سر کے مل دوڑتا ہوا وہاں پیچ جاؤں؟“ حمید نے چھنجھلا کر کہا۔

”نہیں ایسی حرکت نہ کرنا۔ وہاں پیچنے کے لئے تم نیکی استعمال کر سکتے ہو۔“

”ویسے بھی میں یہی کو پڑنہ استعمال کرتا لیکن ریکھا کیا کروں؟“

”کیا وہ تمہارا دم سے بند ہی ہوتی ہے؟“ فریدی نے ناخوش گوار لبجھ میں کہا۔

”اچھا تو میں پول میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”نگرانی!...!“

”میرے خدا...!“ حمید بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں کسی بھینی کی گرفتاری کر سکتا ہوں مگر کسی لوکی کی گرفتاری دور سے نہیں ہو سکتی۔ آپ خود سوچنے کے کیسی دشواری ہوتی ہو گی۔ دل کو کس طرح سمجھاتا ہوں گا۔ مگر میرا دل آج کل اردو میں تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔“

”بیواس بند میں پول جاؤ۔ اب دور سے بگرانی ضروری نہیں۔ تم اس سے قطعی مل سکتے ہو اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تم اسے اپنانام اور پتہ غلط بتاؤ۔“

”خدا آپ کو اس سے زیادہ ترقی عطا فرمائے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر اسے لمبی لمبی دعا میں دینی شروع کر دیں لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

”حمدید پھر ہاں میں واپس آگیا۔ ریکھا باب بھی اُسی میز پر موجود تھی۔

حمید نے اس سے کہا۔ ”میرے پیچنے کی بیوی کے سالے کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے مجھے وہاں دس منٹ کے اندر اندر ہی پیچ جانا چاہئے۔“

”ارے.... وہ... وہی تو نہیں جو.... وہاں رہتے تھے۔“

”ہاں وہی!...!“

”تب تو میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ کیونکہ مر حوم سے میری بھی جان پچاہن تھی۔“

”وہ دوسرے تھے تم انہیں نہیں پیچا نہیں۔“

”میں اچھی طرح جاتی ہوں۔ پیچھے ہی سال ہم دونوں ساتھ کام کرتے تھے۔“

”انہوں نے آج تک کوئی کام ہی نہیں کیا۔“

”تمہیں نہ بتایا ہو گا۔ میں بھی چلوں گی۔“

ریکھا اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”آؤ“
”نہیں میں پچھے ہی ٹھیک رہوں گا۔“ حمید پچھلی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔
”کہاں چلوں؟“
”ارجن پورہ۔“ حمید نے ہانپتے ہوئے کہا۔

چھمن

جیسے ہی کارپارک لین میں گھسی حمید نکل بھاگنے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہاں بھیڑ بہت زیادہ
تھی۔ فقار کم ہو گئی اور ریکھا کی توجہ بھی سڑک پر تھی۔ حمید نے با آہستگی دروازہ کھولا اور اندر کر
سننے والی گلی میں ہولیا۔ کچھ دور تک اسے اتنی تیزی سے چلانا پا کہ کلیچ ہلن میں آگیا۔
وہ دیے بھی اب ریکھا سے پچھا چھڑانا چاہتا تھا کیونکہ فریدی سے اس لڑکی سے اسربط و ضبط
پیدا کرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ پھر کسی نئی لڑکی کے مقابلے میں ریکھا کا کام۔
اس نے گلی سے نکل کر ایک نیکی کی اور منے پول ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔
انور اور شاپنہ والا واقعہ اس کے ذہن سے اتر چکا تھا اور اب وہ صرف اسی لڑکی کے متعلق
سوچ رہا تھا۔

میں پول ہوٹل پہنچ کر اس نے جیکسی کا کرایہ ادا کیا اور اندر چلا آیا۔
ڈائینینگ ہال قریب سنان پڑا ہوا تھا کیونکہ دوسرا طرف ریکھ بیٹھنے والے آر کسٹرا
کی آواز منظر ہو رہی تھی۔
اس نے ریکھ بیٹھنے والے کامکٹ خریدا اور پھر زندگی کے اس طوفان میں جاؤ و بجا جاں رنگ و
نور و غہٹت سمجھ کچھ تھے لیکن اس بھیڑ میں اس لڑکی کو متلاش کر لینا آسان کام نہیں تھا۔
لڑکی ملتی یا نہ ملتی مگر وہاں قاسم کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بائیں جانب والی
گلیری کی ایک میز پر تھا تھا اور اس طرح متھ کھولے ہوئے رقص دیکھ رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی
بار اتفاق ہوا ہو۔ حمید آہستہ آہستہ چلا ہوا اس کی پشت پر پہنچا۔ قاسم اتنا منہک تھا کہ اسے خبر
بھی نہ ہوئی۔

”کیوں... مزہ آرہا ہے۔“ حمید اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے بولا۔

حمد سوچنے لگا۔ یہ کیا مصیبت آئی۔ ریکھانے کہا۔ ”میں آج تمہیں تھا کہیں نہ جانے والے
گی۔ تمہارے سدارے اتنجھے نہیں ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ تم مجھ سے زیادہ جیوتش نہیں جانتیں۔“

”جو تاش کی ایسی کی تیسی میں تو چلوں گی۔ ورنہ تم بڑے خسارے میں رہو گے۔ میں تجھ کہنی
ہوں یہیں کوئی دوسرا طوفان کھڑا ہو جائے گا اور تم اپنی گردان نہ چھڑا سکو گے۔“

”اڑے باپ رے۔“ حمید کراہ کر کر سی میں ڈھیر ہو گیا۔ پھر چند لمحے بعد بولا۔ ”فری...
فریدی صاحب کافون تھا۔ وہ مجھے ایک جگہ کام سے بھیجا چاہے ہیں۔“

”پچھے بھی ہو۔ میں چلوں گی۔“

”چلوگی؟“

”ہاں ضرور چلوں گی۔“

”اچھا تو دو منٹ تھہرو۔“ حمید نے اٹھنا چاہا لیکن ریکھانے اس کے کوٹ کا دامن پکڑ
آہستہ سے کہا۔ ”کیا فائدہ میں سب کے سامنے گریبان میں ہاتھ ڈال دوں۔“

”مر گئے۔“ حمید بھرائی ہوئی آواز میں بڑی بڑی سے بولا۔ ”اگر مجھے دیر ہوئی تو اس
کے لئے تمہیں جواب دی کریں پڑے گی۔“

”میں کروں گی۔ تم فکر نہ کرو۔“

”اچھی بات ہے چلو۔“ حمید ایک طویل سانس لے کر بولا۔
اس کے ساتھ ریکھا بھی اٹھ گئی۔ وہ دونوں باہر آئے۔

”میری گاڑی موجود ہے۔“ ریکھانے کہا۔

”ہمیں تمہارے پاس بھی گاڑی ہے؟“

”میری نہیں۔ میرے بھائی کی ہے۔“

”میں تو سمجھتا تھا کہ تم اس دنیا میں تھا ہوا اسی لئے مجھے تم سے اتنی ہمدردی تھی۔ اب تمہارا
راستہ الگ ہے اور میر الگ۔“

”کل سے۔ اس وقت تو دونوں ایک ہی راستے پر چلیں گے۔“

”فادر ہارڈ اسٹوں میرے سر کے ہزار نکڑے کر دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ ریکھا کو ساتھ نہ
لے جائتا۔“

”بکتے رہو۔ مجھے کچھ نہیں سائی دیتا۔“

”ہاں....!“ قاسم نے سر ہلا کر جواب دیا۔ پھر پونک کر مرتا ہوا بولا۔ ”قاں... آنے...“
”ابے بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کر۔“ حمید نے جھنجلا کر کہا۔ ”جب میں تمہیں ڈانٹوں تو
بپ چاپ وہاں سے کھک جاتا کیا سمجھے۔“
”نہیں... نہیں... تم کچھ گھپلا کرنا چاہتے ہو۔“
”کوئی گھپلا نہیں پیارے۔ اگر وہ نہ تاچے گی تمہارے ساتھ تو اُس کی بڑی بہن تاچے گی۔ وہ
دیکھو۔ وہ بھی تریکی عورت جو بزرگ کے پھول دار اسکرٹ میں ہے۔“
”کہہر....؟“ قاسم کی باخچیں پھر کھل گئیں۔
”وہ دیکھو“ حمید نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”وہ جو ایک مرغ نما آدمی کے ساتھ ناچ رہی ہے۔“
”اوہی... ہی ہی ہی۔“ قاسم اپنا جسم سکوڑ کر ہنسا پھر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔
”ہے نا... گھوڑی۔“ حمید نے پوچھا۔
”الا قسم... بالکل فٹ۔“
قاسم کی نظریں اُس بھی تریکی عورت کا تعاقب کرتی رہیں جو ایک دبلے پتلے آدمی کے ساتھ
نچ رہی تھی اور حمید دوسرا ہی فکر میں تھا۔ اُس نے کہا۔ ”تم اس سے برابر یہی کہتے رہنا کہ تم
س کے ساتھ رقص کرنا چاہتے ہو۔“
”اچھا تو پھر....؟“ قاسم بہت زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔
”میں تمہیں وہاں سے ڈانت کر بھگا دوں گا۔“
”نہیں۔ یہ گھلپے والی بات ہے۔“
”جب تک میں تمہیں ڈانٹوں گا نہیں وہ گھوڑی عورت تمہاری طرف متوجہ بھی نہ ہو گی۔“
”ابے حمید بھائی! کیوں لاونا تاتا ہے مجھے۔“
”اچھا جانے دو۔ میں خود ہی باری باری سے دونوں کے ساتھ ناچ لوں گا۔“
”تمہاری بات ہی میری سمجھ میں نہیں آتی۔“
”دیکھو... قاسم بھائی صاحب یعنی کہ مطلب یہ ہے کہ دونوں بہنوں میں چلی ہوئی ہے۔
اُر میں تمہیں اُس کے پاس سے ڈانت کر بھگا دوں گا تو اُس کی بڑی بہن یعنی کہ وہ گھوڑی والی
عورت تمہیں ہاتھوں ہاتھ لے گی۔ کیا سمجھے۔“
”اب سمجھ گیا۔“ قاسم سمجھ گی سے سر ہلا کر بولا۔ ”یعنی وہ اُس کی جلن میں میرے ساتھ
پنچ پر تیار ہو جائے گی۔“

”ہاں....!“ قاسم نے سر ہلا کر جواب دیا۔ پھر پونک کر مرتا ہوا بولا۔ ”قاں... آنے...“
آپ ہیں۔ جائے... جائے... ترشیف... تشریف لے جائے۔
”کیوں پیارے بھائی۔ کیوں خفا ہو۔“ حمید بیٹھتا ہوا بولا۔
”بل جاؤ۔ چلے جاؤ... ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ تم سالا ہماری بیوی کو خراب کرتا ہے۔“
”کیا مطلب...؟“
”تم نے اُس سے کہا تھا کہ قاسم تمہیں دوستوں میں گالیاں دیتا پھر تاہے۔“
”نہیں یہ تو تمہارے والد صاحب کے متعلق کہا تھا۔“
”قیا....!“
”یہی کہ تم دوستوں میں اپنے والد صاحب کو گالیاں دیتے ہو۔“
”ابے تم دغا باز اور جھوٹے ہو۔“
”میں کیا جانوں یہ بات تمہاری بیوی نے مجھے بتائی تھی۔“
”جھک مارتا ہے سالی۔ تم نے یقین کیے کر لیا۔“
”اب نہیں کروں گا۔“ حمید نے کہا اور قاسم اس طرح مطمئن ہو گیا جیسے کوئی بہت بڑا مسئلہ
ٹھیک ہو۔ وہ دفاتر نکالے رقص کرتی ہوئی چکلی لڑکی کو دیکھتا رہا۔
”قاسم! تم نے کبھی رقص کیا ہے؟“
”بنتا ہی نہیں سالا...!“
”کوشش کرو۔“
”کس کے ساتھ کوشش کروں۔ کون تاچے غی میرے ساتھ۔ میں اپنے ڈیل ڈول پر بہت
لعت بھیجا ہوں۔“
”مگر میں تمہیں سکھا سکتا ہوں۔“
”تو سکھا دتا پیارے! الا قسم زندگی بھرا حسان مانوں گا۔“
”لڑکی تم تلاش کرو۔“
”میں کہاں تلاش کروں۔“ قاسم نے کسی یتیم بچے کی طرح بے بی سے کہا۔
”اس بھیڑ سے کسی لڑکی کو منتخب کرو میں معاملہ طے کر دوں گا۔“
”اماں.... نہیں۔!“ قاسم بھاڑ سامنہ پھیلا کر ہنسنے لگا۔
”پرواہ نہ کرو۔ اگر میں نے دیکھا کہ اُسے غصہ آگیا ہے تو تمہیں ڈانت کر بھگا دوں گا۔“

”چلا آیا۔ دوسری طرف قاسم تھا کہ اُس کی سرگوشیاں کسی طرح رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ ن... وہ مژدی... وہ رکی... یا الہا... چلی گئی۔“ پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب پہنچو گا جید بھائی؟“

”میرا بھرتا بنے گا۔“ جید جھلا کر اُسکی طرف مڑا۔ نہ جانے کیوں اُسے قاسم پر غصہ آگیا تھا۔ ”اُس کی بڑی بہق... بہن!...!“ قاسم کی آواز حلق میں چھنسنے لگی۔

”جہنم میں جائے۔“ ”ارے واد۔“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔ ”وہ سالی چلی گئی تو مارو گولی... اُس کی بہن بے چاری نے کیا قصور کیا ہے۔“

جید جواب دیئے بغیر ریکریٹیشن ہال کی طرف مڑ گیا۔ قاسم گویا دم کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ جید کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اس میز پر لا یا جہاں سے وہ کچھ دیر پہلے انھے تھے۔

”بیٹھو... پیارے جید بھائی... الا قسم... بعض ادکات تم سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے۔“ ”ہاں... ہو سکتا ہے۔“ جید سر ہلا کر بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس نے لڑکی کا تعاقب کیوں نہ کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اُسے نظر میں رکھنا ضروری رہا ہو۔ ورنہ فریڈی اُسے خصوصیت سے یہاں کیوں بھیجا۔

”ارے... غمید... بھائی!...!“ دفعتاً قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ دیکھو۔“ ”کیا ہے یار!...!“ جید جھنجلا کر بولا اور اُسی طرف دیکھنے لگا جدھر قاسم دیکھ رہا تھا اور پھر اُس کی جھنجھلابت بالکل ہی کافور ہو گئی کیونکہ وہی لڑکی پھر ریکریٹیشن ہال میں داخل ہو رہی تھی لیکن اس بارہ وہ تنہا نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔

”چلو اٹھو!...!“ قاسم اُسے بھجنھوڑتا ہوا بولا۔

”بیکار ہے بیٹا!... اب وہ تنہا نہیں ہے۔“

”تو اس سے کیا!... وہ سالا بولے گا تو گردن تو زدؤں گا۔“

”بس بیٹھے رہو۔“

”اچھا اُس کی بہن!...“

جید کچھ نہ بولا۔ اُس کی کھوپڑی پر اب بڑی طرح بر ف پڑ گئی تھی۔ اُس نے جو کچھ سوچا تھا۔ ”وہ سکا۔“

تیرے راؤٹر کے لئے موسیقی شروع ہونے والی تھی اور لڑکی کے ساتھ آئنے والا آدمی

”بالکل بالکل۔ خیر سمجھے تو تم... گریا ر... آج کل تم کچھ اوس اوس سے نظر آتے ہو کیا بات ہے؟“

”کیا پوچھتے ہو جید بھائی۔“ قاسم نے ٹھنڈی آہ بھرنے کی بجائے ایک گرم سا جھونکا پھیل ہوئے کہا۔ ”وہ سالی مجھے زندہ رہنے دے گی۔“

”مگر میرا خیال ہے کہ تمہاری کوئی سالی اتنی مگری نہیں ہے۔“

”تم سمجھے نہیں۔ میں اُس چیز کی بات کر رہا ہوں جسے لوگ میری بیوی سمجھتے ہیں۔“

”کیوں کیا کوئی نی ہات؟“

”ہاں!...!“ قاسم گلو گیر آواز میں بولا۔ ”وہ ایک نوکر کا پچھے لے کر پال رہی ہے اور مجھے اُس کا ذیہی کہتی ہے۔ تم خود سوچو جید بھائی...!... کتنی تکلپھ...!... تکلیف...!... تکلیف دہ بات ہے۔“

”تمہارا کیا بگرتا ہے...!... کہنے دو۔“

”ارے وہ میرا مناق اڑاتی ہے...!... الو کی پیٹھی۔“

”پچا کی پیٹھی۔“ جید نے صحیح کی۔

”پچا خود الو کا پٹھا ہے۔ سالا۔ آخر اُس نے ایک چوہا یا تھی کے پلے کیوں باندھ دی تھی۔“

”قاسم تم شاعر ہوتے جا رہے ہو۔“

”چھوڑو یار جید بھائی۔ لعنت ہے اپنی زندگی پر۔ اب اُس سالی نے اپنی ایک خالہ کو بھی بلا کر گھر میں رکھا ہے۔ دن میں کئی بار دل چاہتا ہے کہ اُس خالا کو غوی!...!... گولی مار دوں۔“

”کیوں؟ کیا عمر ہو گئی خالہ کی؟“

”چھوڑو یار گولی مارو!...!... ہو گی کچھ...!“

”بوڑھی ہے؟“

”تم یہ قیوں پوچھ رہے ہو۔“ قاسم اُسے گھونے لگا۔

”کچھ نہیں... یو نہی... اوہ دیکھو۔ راوٹن ختم ہو گیا ہے اب اٹھو۔ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ دونوں جھیٹتے ہوئے بار کے کاؤنٹر کی طرف چلے یو نکہ وہ لڑکی اُسی طرف جا رہی تھی جید کا خیال تھا کہ وہ وہاں سے شراب خرید کر پھر اپنی میز پر آجائے گی لیکن اُس کی اس توقی پر اوس پڑ گئی کیونکہ وہ شاید چند سینکڑے کے لئے کاؤنٹر پر ہاتھ بیک کر بار میں کی طرف بھلی تھی اور پھر اُس کا رخ دروازے کی طرف ہو گیا تھا۔ جید بے بی سے اُسے جاتے دیکھا رہا۔ اُس کی رفتار اتنا تیز تھی کہ جید نے تعاقب کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ویسے وہ یو نہیں بے خیال میں ڈائیننگ ہال میں

اُسی کی میز پر تھا۔ حمید نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ لڑکی بیہاں تھا ہے کوئنکہ فریدی نے جس آدمی کے متعلق فون پر کہا تھا اس قسم کے کسی آدمی کے ساتھ حمید بنے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ اسی لئے وہ اتنی دیر تک قاسم کے ساتھ سر مارتا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر قاسم اُس لڑکی کے سامنے ہو گیا تو اُسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ پھر ایسے موقع پر اگر حمید اُسے قاسم سے ”نجات“ دے دے سکتا تو اُس کی طرف لڑکی کا متوجہ ہو جانا لازمی تھا۔

گراب وہ کیا کرتا۔ اب توہ تھا نہیں تھی۔ اُسے اس آدمی پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کی طرح کوئی غیر ملکی نہیں تھا۔ تین پیشیں سال کا ایک خوش و اور صحت مند جوان تھا۔ خود خال سے سخت گیری متریخ تھی۔ حمید اُسے گھورتا رہا۔
موسیقی شروع ہو گئی لیکن وہ دونوں بیٹھے ہی رہے۔ قاسم بڑا بڑا رہا تھا۔ ہائے اُس کی بڑی بین۔ وہ گئی۔ وہ گئی۔... نکل گئی۔

حمید نے دوسری طرف دیکھا وہ لمبی تر گلی عورت ایک آدمی کے ساتھ رقص کرنے کے لئے اٹھی تھی۔ قاسم بڑی طرح ہاتھ مل رہا تھا۔

”یار حمید بھائی۔ تم دل توڑ دیتے ہو۔“ قاسم گلوگیر آواز میں بولا۔
”تمہاری قسمت ہی خراب ہے، میں کیا کروں۔“
”تم کچھ نہ کرو، اب میں خود ہی کچھ کروں گا۔“
”میا کرو گے؟“

”آگ لخادوں گا اپنے گھر میں۔“

”چلو! خاموش بیٹھو۔ خان بہادر صاحب کا ہنڑا اس وقت شاید بھول گے ہو۔“
حمید نے قاسم کو خاموشی سے دانت پیٹتے دیکھا۔ رقص شروع ہو چکا تھا اور کبھی کبھی رقص اصول کی بھیڑ سے دوسری طرف کی گلری میں بیٹھی ہوئی وہ لڑکی بھی نظر آ جاتی تھی۔ دفعھا ایک پار گھید کو ایسا لگا جیسے اب وہ اپنی میز پر تھا ہو۔ وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ اب وہ دوسری طرف کی پوری گلری صاف دیکھ سکتا تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اب وہ لڑکی اپنی میز پر تھا تھی۔

حمید نے ایک طویل سانس لی اور دوسری گلری کی طرف پل پڑا۔ قاسم اُسے پکارتا ہی رہ گیا۔ دوسری گلری میں پیچ کر دے لڑکی کے قریب ہی کھڑا ہو گیا لیکن دفعھا اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوفزدہ ہی ہے۔ حمید نے چاروں طرف نظر درڈائی لیکن وہ آدمی کہیں نظر نہ آیا جو کچھ دیر پہلے اُس کے ساتھ تھا۔

لوکی خوفزدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایک بار دونوں کی نظریں ملیں اور پھر وہ شستہ متوں میں دیکھنے لگے۔ اچاک حمید آگے بڑھ کر آہستہ سے بولا۔ ”لیا آپ میری ہم رقص بنانپس کریں گی۔“

”جی۔!“ وہ چونکہ پڑی اور پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”مجھے افسوس ہے، میں بہت جھک گئی ہوں۔“

”تحکن تو زندگی کے ساتھ ہے۔“ حمید فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”خیر میں خود کشی کر لوں گا۔“ پھر اُس نے محسوس کیا کہ لڑکی نہ صرف اُسے شہبے کی نظر سے دیکھ رہی تھی بلکہ اُس کے پیڑے پر پھیلی ہوئی زردی کچھ اور گہری ہو گئی ہے۔

”آپ کچھ خوفزدہ سی ہیں۔“ حمید اُس کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔

”اوہ.... نہیں تو.... کیوں؟“ لڑکی اب تھیر نظر آنے لگی۔
”آپ خوفزدہ ہیں۔“

”پھر.... آپ نے اس بے تکلفی کی جرأت کیے کی۔ میں کوئی سوسائی گرل نہیں ہوں۔“

”اور میں بھی کوئی لفڑا نہیں ہوں۔ ایک شریف آدمی۔“ حمید مسکرا یا۔

لڑکی کری کی پشت سے نکل کر اسے گھورنے لگی۔ حمید اُسکی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکراتا رہا۔ دفعھا لڑکی آگے جھک کر میز پر کھدیاں لیتی ہوئی آہستہ سے بولی۔ ”کیا تم مجھے خوفزدہ کر سکتے ہو۔ ہر گز نہیں۔ یہاں میرے حمایتی بھی موجود ہیں۔ تم کوئی حرکت کر کے دیکھو۔“

”تم کسی غلط فنی میں بتلا ہو۔“

”لیا میں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔“ لڑکی نے غصیل آواز میں کہا۔

”نہیں....!“

”پھر....؟“

”پھر میں کیا بتاؤں! آج میرے اور تمہارے ستارے کچھ اسی قسم کے ہیں۔“

لڑکی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن حمید نے اُسے یک بیک چوکتے دیکھا۔ وہ ہاں کے صدر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

حمید بھی مڑا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اُس کے ہونٹ کھل اور ایک بیکی سی ”سکی“ ہونٹوں سے باہر آگئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے بازو میں سوئی چھبی گئی ہو۔ اُس کا بیاں ہاتھ پر اختیار انہی انداز میں بازو پر پڑا اور وہ پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نے کچھ اس

”میرے پاس بر باد کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔“
”یہ بہت اچھا ہے۔ ورنہ تم اس وقت چائے میں شکر کی بجائے لکھیا استعمال کرتے۔“
”کیوں.....؟“

”کل تم نے آر لکھوں میں کس لڑکی کو شراب پلانی تھی۔“
”اوه.... تو کیا اُس کے متعلق کچھ ہے؟“
”ہاں.... آں.... تو یہ حقیقت ہے؟“
”کیا لکھا ہے اُس نے؟“
رشیدہ اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔

”کرام رپورٹر کے جرام۔ ایک مقامی اخبار کا کرام رپورٹر بچپنی رات ایک بڑے ہوٹل میں رہا پہنچا گا۔ یہ رپورٹر شہر میں خاصی شہرت رکھتا ہے اور اعلیٰ پوسٹ لیس افسروں سے اس کے مراسم ہیں۔ غالباً بھی وجہ ہے کہ اخلاقی اور سماجی پابندیوں کا قائل نہیں ہے۔ اگر یہ حرکت کی اور سے سرزد ہوتی تو وہ اس وقت جیل میں ہوتا لیکن ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں سے مراسم لکھا ہے جو قانون کے محافظت کھلاتے ہیں بچپنی رات آر لکھوں میں جو ہنگامہ ہوا اگر دنیا کے کسی اسرے مہذب ملک میں ہوا ہوتا تو۔“

”بُن بند کرو۔“ اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔
”تو یہ حقیقت ہے۔“ رشیدہ نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ ”اور وہ سرمایہ دار لڑکیون تھی؟“

”شایہ نہیں۔ اُس کے متعلق کیا ہے؟“
”وہ بھی بہمنہ ہو کر اُس کرام رپورٹر کے ساتھ ناچیتی رہی۔“
”اور آبزور کا لیٹھیر اپنے دفتر میں سارگی بجا تارہ تھا۔ خیر اُس کی بھی شامت آگئی ہے۔“
”قصہ کیا تھا؟“

”شایہ نہیں پر کسی قسم کا درود پڑا تھا اور اُس نے اپنے کپڑے چھاڑا لے تھے۔“
”اور تم....؟“
”اور اب مجھ پر اس وقت دورہ پڑنے والا ہے۔“
”پرواہ مت کرو۔“ رشیدہ گردن جھک کر بولی۔ ”اس وقت بھی میرے پیروں میں باتا کے بیندیں ہیں۔ تم آخر شایہ نہیں کوہاں لے کیوں گئے تھے؟“

انداز میں اپنی کری چیچے کھکھلائی چیسے یہ حرکت اُسی نے کی ہے۔ حید کو اپنے سارے جسم میں گرم گرم لہریں سی محسوس ہو رہی تھیں اور جس جگہ سوئی کی چین سی محسوس ہوئی تھی دہاں اپنی تکلیف تھی چیسے وہ کوئی مواد بھرا پھوڑا ہوں لڑکی اٹھ گئی مگر حید زبان بھی نہ ہلا سکا۔ وہ اُسے جانے دیکھتا رہا لیکن اُس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ آر کسٹر اسی موسيقی اُسے اسکی لگ رہی تھی چیسے وہ کسی بچھلی ندار کیٹ کے معنی شور ہو۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شاید پیروں میں دم ہی نہیں تھا۔ اُس کے سارے جسم سے ٹھنڈا اپسینہ چھوٹ پڑا لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اُس میں موجود تھی۔ اُس نے دوسری گیلری کی طرف دیکھا۔ قاسم اب بھی دہاں موجود تھا اور حید ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حید اُسے بلاں کے لئے زور زور سے سر ہلانے لگا۔

پھر کچھ دیر بعد وہ اُس سے کہہ رہا تھا۔ ”قاسم مجھے گھر پہنچا دو۔ خدا کی قسم میں اپنی قوت سے چل بھی نہیں سکتا۔ شائد تمہیں مجھ کو گود میں اٹھانا پڑے۔“
”آماں نہیں۔ کیوں مذاخ کرتے ہو۔“ قاسم ہنسنے لگا۔
”میں تج کہہ رہا ہوں۔“ حید اپنے شنک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”جلدی کرو یا پھر فریدی صاحب کو فون کر دو۔“

خطرناک تھنہ

رشیدہ نے چائے کی ٹرے کے ساتھ ہی اخبار بھی میز پر رکھ دیا لیکن اُس کے باوجود بھی جب انور نے چائے اٹھیتے وقت اخبار کا مطالبه کیا تو اُسے غصہ آگیا۔
”تم اندھے ہو شاید۔“

”ہاں میں اندھا ہوں اس لئے آج سے خبریں بھی تم ہی پڑھ کر سناؤ گی۔“
”میں نو کر ہوں تمہاری؟“
”یہ ایک بہت پرانا سوال ہے جس کا جواب میں نے بھی نہیں دیا۔“
”بچپنی رات کیا ہوا تھا؟“ رشیدہ اُسے گھورتی ہوئی بولی۔
”چکھ بھی نہیں۔ جس بات کا تعلق تمہاری ذات سے نہ ہو اُسے نہ چھیڑا کرو۔“
”آبزور کا اداری پڑھا ہے تم نے؟“

”کیونکہ اُسی کی بدولت میرے قرض خواہوں نے پھر مجھ سے محبت شروع کر دی ہے“
”اوہ..... تو کیا..... وہ تم سے کوئی کام لے رہی ہے۔“
انور کچھ نہ بولا۔ رشیدہ چند لمحے اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”تم یہ بات مجھ سے کیز
چھپا رہے ہو؟“

”تم پر ظاہری کون سی بات ہے۔“

”میں پوچھتا بھی نہیں چاہتی۔“ رشیدہ چڑھ کر بولی۔
”شکریہ۔“

انور چائے پیتا رہا۔ اخبار اُس کے سامنے تھا۔ دھننا اُس کی نظر ایک دلچسپ خبر پر پڑی۔ خود
اُس کا اخبار اُس خبر سے محروم ہی رہ گیا تھا۔ اگر بھی رات وہ خود بھی ایک معاملے میں نہ الہ گیر
ہوتا تو یہ خبر نا مکمل صورت میں نہ شائع ہوئی۔

خبر تھی۔ ”محلکہ سراغِ رسانی کے ایک آفسر کیٹین حید کا حیرت انگیز تجربہ۔ گذشتہ شہ
آفسر مذکور کو ایک حیرت انگیز واقعہ سے دوچار ہوتا پڑا۔ وہ میں پول رقص گاہ میں ایک غیر ملکی
خاتون سے گفتگو کر رہے تھے۔ دھننا انہوں نے اپنے دامنے بازو میں جھجن سی محسوس کی اور ان کا
جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ ان کا بیان ہے کہ جھن محسوس ہونے سے قبل وہ اُس خاتون کی
طرف متوجہ نہیں تھے۔ وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اس واقعہ میں اُن خاتون کا ہاتھ قابا
و بھی اس سے لालم تھیں۔ ذرا ہی دیر میں آفسر مذکور کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ اُن خاتون سے اپنی
کیفیت بھی نہ بیان کر سکے اور وہ اٹھ کر چل گئی۔ ان کی ملاقات اس واقعہ سے چند منٹ پہلے
ہوئی تھی۔ آفسر مذکور ان کے نام سے بھی واقعہ نہیں ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جس بجہے چھن
محسوس ہوئی تھی وہ ذرا ہی کی دیر میں کسی پھوٹے کی طرح دکھنے لگی۔ وہ اس طرح بے حس
حرکت ہو گئے تھے کہ ان کے ایک دوست انہیں گود میں اٹھا کر رقص گاہ سے باہر لے گئے اور پھر
جب وہ ان کی کار پر گھر جا رہے تھے تب اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں حیرت انگیز طور پر پہلے کی
ہی سی حالت میں لے آئے۔ ان کا جسم پہلے ہی کی طرح جاق و چوبند ہو گیا اور بازو کی تکلیف بھی
اتی ہی رہ گئی۔ بختی کسی سوتی کے چچھ جانے کی بجائے پر ہو سکتی ہے۔ بعد کی اطلاع ہے کہ ان کے ملنی
معافی سے بس اتنا ہی معلوم ہوا کہ بازو میں کوئی نوکی لیلی چیز چھو گئی تھی۔ لیکن اُس کے خواب
اڑات ان کے خون میں نہیں مل سکے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ وہ چھنے والی چیز ایک معمولی سوتی
کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔“

”واہ بھی! کیا بات ہوئی۔“ انور بڑپڑا لیا۔

”میا....؟“ رشیدہ چوک پڑی۔

انور نے اخبار اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جب رشیدہ پڑھ چکی تو اُس نے کہد ”آخر اس خبر کی
شاعت کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہے دلچسپ....!“

”مگر وہ تو آر لکھوں میں تھا اور یہ خبر میں پول سے تعلق رکھتی ہے۔“

انتہے میں فون کی گھنٹی بجی اور انور نے ہاتھ بڑھا کر رسیور اٹھالیا۔

”انور....!“ دوسری طرف سے نوانی آواز آئی۔

”کون....؟“

”اوہ.... کپڑے پہن رکھے ہیں تم نے؟“

”انور خدا کے لئے میرا معلمگہ نہ اڑاؤ۔ اب شاید ہی تم کبھی مجھے گھر سے باہر دیکھ سکو۔“

”انور میں الٹا کرتی ہوں کہ میری بات سن لو۔ اس قسم کا دورہ مجھ پر کبھی نہیں پڑا۔ میں کسی

ذہنی مرض میں بنتا نہیں ہوں۔“

”آر لکھوں کے نیجہ کا خیال ہے کہ تم بھٹک پی کر آئی تھیں۔“

”بکواس ہے۔ سکریٹ کے علاوہ اور میں ہر قسم کے نئے سے دور رہتی ہوں۔“

”خیر.... تو اب کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں یقیناً کسی مصیبت میں بنتا ہیں۔ وہ کچھ کھل رہی ہیں لیکن اسی حد تک کہ مجھے تم سے نہ

ملنے دیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اُسی خطرناک آدمی کی حرکت تھی جو آج کل ان کی پریشانی کا

باعث بنا ہوا ہے۔ اُس نے شاید انہیں اس سے آگاہ بھی کر دیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ اگر اس

گھر کے کسی فرد نے پولیس یا کسی پرائیورٹ سراغ رسال سے ساز باز کرنے کی کوشش کی تو اُسے

ای طرح ذلیل کیا جائے گا۔“

”اوہ.... لیکن تمہاری میں کچھ بتانے پر تیار نہیں؟“

”نہیں قطعی نہیں.... وہ کہتی ہیں کہ اگر تم میری زندگی چاہتی ہو تو اپنی زبان ہر معاملے

میں بذرکھو۔“

”یہ بہت بُری بات ہے۔ پھر اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں اب بھی وہی چاہتی ہوں جس کے لئے تم سے ملی تھی۔“

”اپنی بھی کی تنبیہ کے باوجود بھی؟“
 ”تم وہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کرتے کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو سکے۔“
 ”ہو سکتا ہے۔ مگر اس طریقے کے اخراجات ذرالبے ہو جائیں گے۔“ اُور نے رشیدہ کو آنکھ مار کر کہا اور رشیدہ ہونٹ سکوڑ کر رہ گئی۔
 ”اخراجات کی پرواہ نہ کرو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”اور آج تم میری سالگردہ کی تقریب میں شرکت کر رہے ہو؟“

”آہ....اوہ....اچھا.... مگر تم مجھے پہچانو گی کیسے؟“
 ”بس جسے نہ پہچانتی ہوں گی وہی تم ہو گے۔“

”سب تمہارے جانے پہچانے آدمی ہوں گے؟“
 ”ہاں....!“

”اور تمہارے سبھی دوستوں سے تمہاری می واقف ہوں گی؟“
 ”نہیں بنتیوں کو نہیں جانتیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ میں آؤں گا۔“
 ”میں دراصل تمہیں اس لئے بلارہی ہوں کہ تم ان دونوں گدھوں کو دیکھ لو۔“
 ”ڈکھی ٹیکس کے متعلق کہہ رہی ہو؟“

”ہاں.... وہی دونوں۔ ہو سکتا ہے می کی پریشانیوں کی وجہ وہی ہوں۔“
 ”میں آؤں گا۔ اچھا.... بس....!“
 ”نہیں اور کچھ نہیں۔“

انور نے رسیور کھ دیا اور رشیدہ کو آنکھ مار کر مسکانے لگا۔
 ”شام نے؟“ اُس نے اس انداز میں کہا جیسے رشیدہ بہری ہو۔ ”میں اس کیس کے اختتام پر ایک اچھی سی کار خرید رہا ہوں۔“

”وہ تو تم کی کیسوں کے اختتام پر خرید چکے ہو۔“
 ”نہیں اس بار ضرور خرید لوں گا۔“
 ”ڈیکھوں گی۔“

انور ناشتہ ختم کر کے اٹھ گیا۔ رشیدہ ویس پیٹھی رہی۔ لیکن وہ انور سے کچھ برگشتہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ اُسی شام کو انور میک اپ میں ارشاد منزل جا پہنچا۔ اس میک اپ میں وہ یوریشین

معوم ہوتا تھا۔

ارشاد منزل کا بڑا ہاں کافی نفاست کے ساتھ سجا گیا تھا اور شاید اس وقت تک آؤٹے سے زیادہ مہمان وہاں پہنچ چکے تھے۔

انور نے شاہینہ کی جستجو میں چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ انور نے سوچا کہیں وہ پیچاں نہ لیا جائے کیونکہ اُس کی موجودہ حیثیت میں وہاں اُس کا ایک بھی شناسا نہیں تھا۔ وہ شاہینہ کی تلاش میں ادھر اورھر بھکتارہ۔ ویسے اُس بھیڑ میں کے پڑی تھی کہ اُس کی طرف توجہ دیتا۔ یہ مجمع کسی پیلک جلے کی سی نو عیت کا حال تھا۔

لیکن آخر کار انور نے انداز سے اُن باپ بیٹے کو پہچان لیا۔ جنمیں دکھانے کے لئے شاہینہ نے اُسے مدعا کیا تھا۔ وہ دونوں ایک میز کے قریب کھڑے کسی مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔

انور اُن کی پشت پر کھڑا ہو کر دیوار سے لگی ہوئی ایک پینٹنگ دیکھنے لگا۔ عمر آدمی خاصاً نومند تھا اور اُس کی ڈاڑھی سرخی باکل تھی۔ اگر نوجوان کے چہرے پر بھی ویسی ہی ڈاڑھی ہوتی تو دونوں کو پہچانا مشکل ہو جاتا۔ بیٹا اپنے باپ کی ہوبہ نقل تھا۔ فرق بس اتنا ہی تھا کہ اُس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں تھی۔

”جب عقل تمہیں رکھتے تو کبکاوس کیوں کرتے ہو۔“ بوڑھا نوجوان سے کہہ رہا تھا۔

”ذیہی میں تم سے زیادہ عقل رکھتا ہوں۔ جب دل چاہے کرلو عقل کا مقابلہ۔“ نوجوان رہا سامنہ بنا کر بولا۔

”تم گدھے ہو۔“

”میری رگوں میں تمہارا ہی خون دوڑ رہا ہے ذیہی۔“

”تو اس سے کیا ہوتا ہے تم اس کے باوجود بھی گدھے ہو سکتے ہو۔“

بات آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ ٹھیک اُسی وقت شاہینہ ادھر آئی۔ وہ آج خلاف معمول غرائبے اور فراک میں تھی۔

نوجوان ڈکی ٹیل نے اپنے حلقت سے محیب سی آواز نکالی اور اُسے روک کر بولا۔ ”مجھے معاف کرنام ارشاد تم اس لباس میں بہت اچھی لگتی ہو.... کیوں ڈیہی۔“

”اوہ.... یقیناً....!“ بوڑھا ڈکی ٹیل سر ہلا کر شفقت آمیز مکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”شکریہ۔“ شاہینہ بڑے دل آؤیز انداز میں مکراہی اور انور پر ایک اچھتی ہوئی سی نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

ڈیڑی۔ ”نوجوان ڈکی ٹیل بولا۔“ یہ لڑکی مجھے خاب دکھاتی ہے۔
”ہاں... آں... ہو سکتا ہے۔“ بوڑھے نے ٹھنڈی سانس لی۔
”تم نے ٹھنڈی سانس کیوں لی ڈیڑی؟“ ”نوجوان بولا۔“

”ہنر... میں تمہیں بہت پیٹوں گا گدھ۔“
”ٹیلیں بتاؤ۔ کیا وہ تمہیں بھی اچھی لگتی ہے؟“

”ہنر... پلیز... ہولڈ یور ننگ۔“ ورنہ مجھے یہاں اس تقریب کے موقع پر بھی غصہ آسکتا ہے۔“
”تمہیں بہت دونوں سے غصہ نہیں آیا ڈیڑی۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”بکاں بند کرو۔“ بوڑھے نے کہا اور دہاں سے چلا گیا۔ ہنر ڈکی ٹیل اس انداز میں اس کے
بیچے چل رہا تھا جیسے سر پر چپت رسید کرنے کا رادہ رکھتا ہو۔

انور بھی دہاں سے ہٹ گیا۔ وہ شاہین سے مٹا چاہتا تھا آخر وہ اسے ایک جگہ مل یعنی گئی۔
”مبارک ہو مس ارشاد۔“ اس نے کہا۔

”ٹکریہ... ٹکریہ۔“ شاہین گرم جوشی سے مصافحہ کرتی ہوئی بولی۔ وہ ٹیکتے ہوئے ایک
طرف چلے گئے۔ شاہین نے کہا۔
”یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر تم اجنبی نہ ہوتے تو میں تمہیں نہ پیچاں سکتی۔ واقعی کمال کرتے ہو
تم بھی.... اُن دونوں کے قریب کھڑے تھے۔“

”ہاں.... میں نے انہیں دیکھا تھا اور وہ دونوں کافی دیر مکہ تمہارے حسن کی تعریف کرتے
رہے تھے۔“

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ وہ کس قسم کے باپ ہیں۔“

”میں بھی نہیں سمجھ سکتا۔“

”اچھا بیں اب میں چلی۔“

”میں ذرا اُدھر بھی جاؤں گا جہاں اُن رات تم نے اپنی بھی کو کسی سے گفتگو کرتے سن تھا۔“

”بھاں دل چاہے جاؤ مگر تمہارا نام کیا ہے؟“

”جوڑ فپیریں!...“

”ڈز ٹیل پر تمہارا کارڈ لگاوائے دیتی ہوں۔“

”ہاں.... آں.... مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ڈز ٹک یہاں ٹھہر دوں۔“

”اوہ اسی غلطی مت کرنا۔ یقیناً وہ نامعلوم آدمی بہت چالاک ہے۔ ورنہ اُسے ہمارے متعلق
ذرا کھانے کے لئے وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ اُس نے تیزی سے قدم بڑھانے اور اُسی دروازے

”ستوم ہوتا۔“

”خیر جیسا مناسب سمجھوں گا ویسا کروں گا۔“ انور نے کہا۔

”ڈلی گئی اور انور اُدھر اُدھر نہ ملتا رہا۔ ہاں میں شراب کی ٹرالیاں چل رہی تھیں۔ ایک اُس
ٹیلیں بھی رکی تھیں لیکن انور نے صرف یمن پر تقاضت کی۔ اگر وہ شراب پیتا بھی ہوتا تو کم از کم اس
ٹیلے پر ہر گز نہ پیتا۔“

اس دوران میں ایک بار بیکم ارشاد سے بھی ڈلی گھیر ہوئی اور اُس نے بڑے بڑے تکلفانہ انداز
مبارک باد پیش کی تھیں لیکن بیکم ارشاد نے ٹکریہ ادا کرتے وقت یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اُسے
ٹیلی نہیں ہے۔

انور نے سوچا کہ اب اس طرح دوسروں سے کئے کئے پھرنا مناسب نہیں ہے لہذا وہ
ذیوں کے ایک جھنڈ میں جالا۔ ان لوگوں نے نوجوان ڈکی ٹیل کو گھیر رکھا تھا اور اُسے عرف
میں بُری طرح ”ٹھس“ رہے تھے۔ انہوں نے شاید اُسکے نام پر بجٹ چیزیں کھی تھی اور ہنر ڈکی
ٹیل کہہ رہا تھا۔ آپ لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ ہمارے نام کے بجے وہ نہیں ہیں جو گدھے کی اڈم کے
ہوتے ہیں، ڈی یو این کے آئی... ڈکی... ٹی اے، ایل ائی.... ٹیل.... (DANKITALE)!
”لیکن اگر ہم اسے اپنی زبان میں لکھیں گے تو گدھے کی دم ہی پڑھیں گے۔“ کسی نے کہا۔
”مجبوری ہے۔“ ہنر ڈکی ٹیل یا پوسانہ انداز میں سرہلا کر بولا۔

”آپ کے دوسرا بھائیوں کے کیا نام ہیں؟“

”ڈیڑی نے ایک ہی شادی کی تھی۔“ ہنر نے آہستہ سے کہا۔ ”اس لئے اور کوئی دوسرا بھائی
نہیں ہے۔“

اس پر قہقہہ پڑا اور ہنر احتفاظہ انداز میں ایک ایک کی صورت دیکھنے لگا۔

”تم اپنی پیدائش کے وقت کتنے بڑے تھے؟“ کسی نے سوال کیا۔

”ٹھہریے... ڈیڑی سے پوچھ آؤں۔“ ہنر نے کہا اور بھیڑ ہٹاتا ہوا الکلا چلا گیا۔

لوگ ہستے رہے لیکن انور کی نظر میں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ اپنے ڈیڑی کے پاس
ہنسنے کے بعد ایک دروازے میں ٹھیک۔ اُس کا ڈیڑی راجرز ڈکی ٹیل شہر کے بڑے سرمایہ دار

سے ٹھکو کر رہا تھا۔ انور بھی نہ ملتا ہوا اُسی دروازے کی طرف چلا۔

لیکن ابھی دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ کھانے کے لئے گاگ۔ بجل۔ یہ حقیقت تھی کہ
ذرا کھانے کے لئے وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ اُس نے تیزی سے قدم بڑھانے اور اُسی دروازے

سے گذر گیا جس سے ہنڑ کی میل گزرا تھا۔ اُس نے خود کو رابداری میں پایا اور اس موقع پر اُس رابداری میں دونوں طرف دروازے اور کھڑکیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ اچانک ایک دروازے سے ایک آدمی کچھ اتنی تیزی سے نکلا کہ انور سے سے نکلا گیا اور اُس کے ہاتھوں میل دبا ہوا ذہبہ فرش پر گردپاٹ جسے اٹھانے کے لئے وہ بڑی پھرتی سے جھکا۔ یہ ہنڑ کی میل خاور ڈبہ اٹھائیں کے بعد کچھ اس انداز میں ہنسنے لگا تھا جیسے چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہو۔

”یہ..... یہ.....!“ وہ بوکھلانے ہوئے انداز میں بولا۔ ”مس ارشاد کے لئے تھے ہے۔“
”تو پھر میں کیا کروں۔“ انور اسے گھورنے لگا۔

”اوہ..... دیکھنے میں اس ملک میں نوادرد ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں کی لوگیاں کیا پڑ کرتی ہیں۔ اس لئے آپ ذرا اسے دیکھ لیجئے۔ جی ہاں..... میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔“

پھر جیسے اُس نے ڈبے کا ڈھلن کھولا اور اچمل کر پھیپھے ہٹ گیا کیونکہ ڈبے میں ایک سیاہ رنگ کا سانپ پھین کاڑھے کھڑا بار بار اپنی سرخ زبان باہر نکال رہا تھا۔ انور کے ہونٹ پھیپھی گئے اور بھنوئیں تن گئیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ دوسرے ہی لمحے میں ڈکنی میل پر حملہ کر پیٹھے گا۔

حُرْمٰ یا مجرم

ڈکنی میل کھڑا ہش رہا تھا۔

”میں بتاؤں تمہیں۔“ انور دانت پیش کر بولا۔

”میں شکریہ ادا کروں گا۔ پتہ نہیں وہ اس تھے کو قبول کرے یا نہ کرے۔“

انور نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا گریبان پکڑ لیا۔

”ارے..... ارے..... یہ کیا.....؟“ ڈکنی میل بوکھلا کر پھیپھے ہٹا۔

”میں بھی مراح کی حس رکھتا ہوں۔“ انور نے گریبان پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا مرح اسی قسم کا ہوتا ہے۔“

”یہ نعلی سانپ ہے دوست.....!“ ڈکنی میل نے قبھر لگایا۔

”میا.....؟“ انور کی گرفت ڈھملی پڑ گئی۔

”ہاں....!“ ڈکنی میل سانپ کا سر چھوٹا ہوا مسکرا یا۔ ”ربر کا سانپ اور پارے کا بیٹھن۔ یہ، جن کی حرکت پارے کے بیٹھن کا نتیجہ ہے۔“

”واہ....!“ انور نے مسکرا کر گریبان چھوڑ دیا اور ذہبہ اپنے ہاتھوں میں لے کر سانپ کا جائزہ نہیں لگا۔ وہ کار بگردی کا ایک بہترین نمونہ تھا۔

”آؤ.... آؤ۔“ ہنڑ کی میل انور کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا بولا۔ ”خاصی تفریخ رہے گی۔“
انور نہایت اطمینان سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ ... لوگ ڈائینگ ہال کی طرف جا رہے تھے۔

”ہائیں.... یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔“ ڈکنی میل نے حیرت ظاہر کی۔
”کھانے کے لئے گاگ بجا رہے۔“

”اوہ..... مگر ابھی کیک تو نہیں کانا گیا۔“

”اوہ..... یہ رسم اس گھر میں نہیں ہوتی۔“ انور بولا۔

”تب پھر میں یہ تھنڈے کس وقت دوں گا؟“

”کھانے کے بعد....!“

”عیوب بے تکنی بات ہے۔“

”یہ باشر ڈسالگرہ ہے۔ دو غلی.... پوری شین....!“ انور ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

”ہااا....!“ ڈکنی میل نے قبھر لگایا۔ ”تم بھی تو پوری شین ہو۔ کیا تم باشر ڈس کو گے خود کو؟“

”یقیناً اگر میں پوری شین ہوں تو ضرور باشر ڈس کہوں گا خود کو۔“

وہ دونوں بھی ڈائینگ ہال میں آئے اور انور کو اپنی نشست ٹلاش کرنے میں تھوڑی دشواری

بھی ہوئی کیونکہ ہال میں تقریباً ڈیڑھ سو مہمان تھے۔

دو تین آدمی نشتوں کے چارٹ لئے پھر رہے تھے۔ ایک نے انور کی بھی مدد کی۔ ڈکنی

میل ایک ہی میز پر تھے۔ کھانے کی ٹرالیاں گردش میں آگئیں۔

انور دونوں ڈکنی میلوں کو گھور رہا تھا۔ لیکن شاید ہنڑ کی میل اُسے بھول ہی گیا تھا کیونکہ اُس

نے ایک بار بھی اسے نظر انداختا کر نہیں دیکھا۔

مدھ مسودوں میں آر کسٹر اچبال اور ہاتھ اٹھاٹھ کر مدد کی طرف جا رہے تھے۔

اچانک پورا ہال تاریک ہو گیا اور یہ وقت بہتیری تھی۔ آمیز آوازیں سنی گئیں پھر کسی

عورت کی جھینیں سائی دیئے گئیں اور انور اچمل کر کھڑا ہو گیا پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی میزالت

گئی ہو۔ پھر تنوں کے تلوٹنے کی آوازیں اندر ہیرے میں پکڑائیں۔ آرکسٹرا تو اسی وقت بند ہو گیا تھا
جب روشنی غائب ہوئی تھی۔ پھر روشنی بھی غائب ہو گئی تھیں لوگ حیران و سر ائمہ کھڑے تھے اور شاہینہ
شور بڑھ گیا۔ پھر روشنی بھی غائب ہو گئی تھیں لوگ حیران و سر ائمہ کھڑے تھے اور شاہینہ
ایک جگہ اچھل کر اپنے بال نوج رہی تھی۔ کپڑے چھاڑ رہی تھی۔

چند لمحے سب کے سب بے حد و حرکت کھڑے رہے۔ پھر یک یک ماراہل گونجے کا
جس کے منہ میں جو بھی آیا کہہ رہا تھا۔

انور نے بیگم ارشاد کو دیکھا جو بلاتی ہوئی شاہینہ کی طرف دیواری جا رہی تھی۔ ”میری
پیچی... میری پیچی۔“

لیکن شاہینہ کے ہاتھ اسی رفتار سے کپڑوں پر چلتے رہے اور زر ایسی دیر میں اس کے جسم پر
دھیماں جھول رہی تھیں۔ تین چار عورتیں اسے پکڑ کر بدقت تمام دوسرے کرنے میں لے گئیں۔
مہمان ذہنی کٹکش میں پیٹلا ہو گئے تھے۔ انہیں کیا کرنا چاہیے؟ چونکہ یہ سب کچھ غیر متوافق
طور پر ہوا تھا اس لئے شاید ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی جواب دے گئی تھی۔

اور انور سوچ رہا تھا کہ وہ پیچاں لیا گیا ہے ورنہ شاہینہ اس حال کو کیوں پہنچتی۔ لیکن اب یہ
بھی دشوار تھا کہ انور باہر نکل جاتا۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ اس واقعہ سے اس کی ضدی طبیعت
جاگ اٹھی ہو۔

دفتار اسے دونوں ڈکی ٹیلوں کا خیال آیا اور اس کی نظریں بے چیزیں نہیں تھے اس میں چکرانے
لگیں۔ آخر ایک جگہ اسے ہنڑہ ڈکی ٹیل دکھائی دیا۔ لیکن بوڑھا ڈکی ٹیل کہیں نہ نظر آیا۔
”خواتین و حضرات۔“ بیگم ارشاد پیچیوں اور سکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ”مجھے
افسوں ہے کہ شاہینہ پر آج پھر دورہ پڑ گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار پر چکا ہے۔ ایسے حالات میں
میں ہمدردی کی مستحق ہوں۔ مجھے اختیار شرمندگی ہے۔“

اور پھر وہ اس سے آگے کچھ نہ کہ سکی کیونکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔
”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔ ”ہمیں افسوس ہے۔“
دو چار لوگ آگے بڑھے اور بیگم ارشاد بھی ڈائینگ ہال سے لے جائی جانے لگی۔ کچھ لوگ
باہر جا رہے تھے۔ انور نے سوچا کہ اب اس کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے لہذا بھی دروازے
کی طرف ہو چاہ پھر شاید ہنڑہ ڈکی ٹیل نے اسے پیچاں لیا اور آگے بڑھ کر بولا۔ ”یہ کیا ہو گیا مسٹر
اب میرے تھے کیا ہو گا؟“

”آئندہ سالگرہ کے منتظر رہو۔“ انور لاپرواٹی سے کہتا ہوا ڈائینگ ہال سے نکل آیا لیکن وہ
ڈکی ٹیلیں کے متعلق بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

زادہ اہری اتنی کشادہ نہیں تھی کہ ڈیڑھ سو آدمی بیک وقت اُس میں سے گزر سکتے۔ اس لئے
ہال بھیڑ معلوم ہونے لگی اور جب انور اپنے لئے راستہ بنا رہا تھا۔ اُسے ایسا محض ہوا جیسے اُس کی
بائیں ران میں سوئی چھپ گئی ہو۔

انور بوکھلا کر چیچپے ہٹا اور ایک آدمی سے گمراہی۔

”زور دیکھ کر جناب۔“ اُس نے کہا اور انور نے مغفرت کر کے آگے بڑھنا چاہا مگر اُسے ایسا
محض ہوا جیسے اُس کا جسم جیرت انگیز طور پر ہلکا ہو گیا ہوا اور اگر اُس نے ایک بیک بھی زمین سے
اخیا تو فتحاں متعلق ہو جائے گا۔ حمارے جسم میں گرم گرم ہی لمبیں دوڑ رہی تھیں۔ دوسرے ہی
لمحے میں اُسے وہ خبریاد آگئی جو اُس نے کیپن حید کے متعلق آج ہی ایک مقامی روزنامے میں
پڑھی تھی۔ ... وہ کسی نہ کسی طرح دیوار سے جانکا اور دوسرے لوگ اُسے گھوڑتے ہوئے گزرتے
رہے۔ اُس نے دونوں ڈکی ٹیلوں کو بھی دیکھا جو خراماں خراماں پڑھے جا رہے تھے لیکن اُس میں اتنی
ست نہیں رہ گئی تھی کہ اپنی جگہ سے جبٹھ بھی کر سکتا۔

کچھ دیر بعد اہر ایسے سنسان ہو گئی۔ اب انور کی ران میں تکلیف بھی بڑھنے لگی تھی جہاں کچھ
دیر پہلے صرف ایک معنوی ہی سوئی کی جبھن محض ہوئی تھی دہاں اب ایسا معلوم ہوا رہا تھا جیسے
کوئی لگی ہو۔ کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ محض کر رہا تھا کہ وہ داہنی جانب گر رہا ہے۔ لیکن خود کو
کرنے سے روک نہ سکتا۔

اور پھر وہ ایک بے بس چوپائے کی طرح زمین پر پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ران کی
تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ بمشکل تمام اپنی کراہیں روک سکتا۔ یہ سب کچھ قائم لیکن سوچنے سمجھنے
کی صلاحیت نہیں زائل ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت کوئی ادھر آکتا تو اُسے ایک بار
ہر بیگم ارشاد کی بکواس سننی پڑے گی۔ پھر اُس نے سوچا ممکن ہے اب بیگم ارشاد ادھر آہی رہی
او۔ شاہینہ کی حالت اسی لئے بگڑی تھی کہ وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ اُسے
کہا دھر رکھ کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔

انور نے غلط نہیں سوچا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بیگم ارشاد اُس کے سر پر موجود تھی۔ اُس کے
سامنے چار ملازم بھی تھے۔

”مسٹر... جوزف... پیئر...!“ وہ رُک کر دانت پتی ہوئی بولی۔ پھر نوکروں سے کہا۔ ”اے اٹھاؤ۔“

انور کچھ نہ بولا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بول ہی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی زبان بھی بقیہ جسم کی طرح حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ سوچ سکتا تھا۔ تو کر اُسے اخلاقی ہوئے ایک کمرے میں لائے اور بیگم ارشاد کے اشارے پر اُسے آرام کریں ڈال دیا گیا۔ ”اس کے کپڑے اُتار کر عکھے کھول دو۔“

اتنا کہہ کر وہ دہاں سے چلی گئی۔ جس آرام کری پر انور کو بھایا گیا تھا اُس کے تین طرف تین میزوں پر عکھے رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انور کے جسم پر صرف زیر جائے رہ گئے اور تین پنکھوں کی تیز ہوا اُسے جسم کے اندر اترنی ہوئی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہو تا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ ران کی تکلیف بھی گھٹ کر سوئی کی چھین ہی کے برابر رہ گئی تھی۔

”اب عکھے بند کر دو۔“ انور نے نوکروں سے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے کپڑے اٹھاؤ۔“ کپڑے اُسے دیئے گئے اور ایک نوکر باہر چلا گیا۔ انور سمجھتا تھا کہ وہ بیگم ارشاد کو اس کی اطلاع دینے گیا ہے۔ اُس نے بڑی تیزی سے کپڑے پہنے اور جیب سے سکریٹ کیس نکال کر ایک سکریٹ منتخب کی اور پھر اُسے ہونزوں میں دبا کر سلاکنے ہی والا تھا کہ بیگم ارشاد کمرے میں داخل ہوئی۔

”تم یہاں کیوں آئے تھے؟“ وہ گرجی۔

انور نے سکریٹ سلاکر لاپرواں سے دیا۔ سلامی ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مدعو کیا گیا تھا۔“ ”میں تم پر کیس دائر کر دوں گی۔“ تم میری پنگی کو بہلا پھسلا کر اُس سے بڑی بڑی رقبیں ایٹھے رہے ہو۔“

”آہا... مس شاہینہ میری قرض دار ہیں۔ وہ مجھ سے دس ہزار روپے قرض لے کر جوئے میں ہار چکی ہیں۔“

”میں... دنکھوا میں تمہیں پھر سمجھاتی ہوں کہ اُس سے ملتا جلتا رک کر دو۔ ورنہ تمہارے انعام پر کوئی رومنے والا بھی نہ طے گا۔“

”شہر کی دو بڑی ماں بیٹی میری قبر پر داؤ نسو ضرور گرا میں گی۔ مجھے یہی موقع ہے لیکن بیٹہ ارشاد مجھے حیرت ہے کہ آپ اس نئی بیماری کے علاج سے بخوبی واقف ہیں۔ پچھلی رات بید بیداری ملکہ سراغِ رسانی کے ایک آفسر کیٹن حمید کو بھی ہو گئی تھی۔“

”ہو گئی ہو گی۔“ بیگم ارشاد نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تم مجھے کسی طرح بھی دھکا نہیں سکتے۔ میں جانتی ہوں کہ قانون کا سامنا کس طرح کرنا چاہئے۔“

”شاہینہ کا بہ کیا حال ہے؟“

”بس اب تم چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کیا شاہینہ نے آپ کو جوزف پیئر کی اصلاحیت سے آگاہ کیا تھا؟“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر اب تم تین منٹ کے اندر ہی اندر یہاں سے نہ چلے گئے تو میں تمہیں سڑک پر پھیکلوادوں گی۔“

انور نے میز سے اپنی فلٹ ہیئتِ اٹھائی اور ختم ہوتے ہوئے سکریٹ سے دوسرا سکریٹ سلاکا یا۔ پھر سکر اکر بولا۔ ”جب کوئی مصیبت پڑے مجھے ضرور یاد کیجئے گا بیگم ارشاد...!“

وہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر رُک گیا اور بیگم ارشاد کی طرف مڑے بغیر بولا۔ ”میری روح اس عمارت کے گرد ہمیشہ منڈلاتی رہے گی۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا عمارت کے باہر نکل آیا۔ کمپاؤنڈ میں کئی جگہ بلب روشن تھے اور شاپ کی گوشے میں بھی اندر ہیرا نہیں تھا وہ اب وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے اگر اندر ہیرا ہوتا تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کرتا۔ وہ سڑک پر آگیا۔

مگر اس طرح چپ چاپ چلے جانا اُس کی طبیعت کے خلاف تھا۔ اُس نے ایک ضدی طبیعت پائی تھی اور انتقام کا جذبہ دباینے میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی رات آر لمحوں میں بھی بیگم ارشاد نے سخت سست کھا تھا اور اب اس وقت بھی۔ حالانکہ اُس کے رویہ کا محرك کوئی اور تھا۔ کون تھا؟ انور فٹ پا تھج پر رُک کر سوچنے لگا۔ ویسے اُسے یوں بھی کسی ٹیکسی کے انتظار میں رکنا ہی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ آخر بیگم ارشاد شہر کی گندی گلیوں میں کیوں بھکتی پھر رہی ہے۔ اُسے کون اس قسم کی سزا میں دے رہا ہے اور کیوں؟ وہ سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ لیکن پولیس کو اس کی اطلاع نہیں دے سکتی۔ ویسے وہ پولیس سے بھی خاف نہیں معلوم ہوتی۔ اگر وہ پولیس سے خاف ہوتی تو انور کو اس حال میں انہوں کا سڑک پر پھیکلوادیتی۔ اُس نے اُس کے لئے اتنی تکلیف کیوں اٹھائی اور پھر جب کہ ملکہ سراغِ رسانی کا ایک آفسر نہ صرف ایسے ہی ایک تجربے سے دوچار ہو چکا تھا لکھ اخبارات کے ذریعہ اُس کی پبلیٹی بھی کرائی تھی۔ بیگم ارشاد نے اس قسم کا خطرہ کیوں مول لیا۔ ویسے یہ تو ظاہر ہے کہ اُس کے متعلق اُسی آدمی سے ہدایات ملی ہوں گی جو اس رُکت کا ذمہ دار تھا۔

لیکن بھروسے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی کہ فریدی اور حیدر گھر پر موجود نہیں ہیں۔
”پھر اب کھربے کیوں ہو؟ واپس چلو۔“ رشیدہ نے اسے گھوڑتے ہوئے کہا۔
”نہیں میں انتظار کروں گا۔“ انور نے کہا اور ذرا ہمگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

انور میک اپ میں تھا۔ اس نے اگر اس کے ساتھ رشیدہ نہ ہوتی تو شاید وہ اتنی بے تکلفی سے ذرا ہمگ روم میں داخل نہ ہو سکتا۔ فریدی کے ملازم رشیدہ کو پہچانتے تھے۔ اس نے انہوں نے کوئی تعریض نہ کیا۔

”کیا تم اس واقعے کی اطلاع فریدی صاحب کو دے چکے ہو؟“

”کس واقعے کی اطلاع؟“ انور نے پوچھا اور اس ملازم کو گھوڑنے لگا جو دروازے میں کھڑا اسے گھوڑ رہا تھا۔ آخر اس نے رشیدہ سے پوچھا۔ ”انور صاحب کہاں ہیں۔“

”کیوں....؟“

”صاحب نہیں فون پر بلار ہے ہیں۔“ نوکرنے کہا۔

رشیدہ اور انور جیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر انور اخا اور ملازم سے بولا۔

”چلو...!“

لیکن ملازم جو اس کی آواز نہیں پہچان سکتا تھا اس انداز میں اسے دیکھنے کا جیسے اس کے اس مذاق پر بہت سخت دست کئے گا۔

”ارے چلنا...!“

”اوہ.... ہو.... آپ ہیں۔“ نوکر ہنسنے لگا۔ پھر وہ دونوں اس کرے میں آئے جہاں فون رکھا ہوا تھا۔

انور نے مضطربانہ انداز میں رسیور اخھیا اور دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔

”تم اگر مجھے یہ بتا بھی دو گے کہ تم بھی آج اُسی تجربے سے دوچار ہوئے ہو جو پہلی رات حیدر کو ہوا تھا تو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“

”آپ جانتے ہیں!“ انور نے جیرت سے دہرایا۔

”بالکل اسی طرح جیسے پانچوں انکلیاں ایک دوسری کو جانتی ہیں۔“ فریدی کی آواز آئی۔ ”اور شاید تم یہ بھی سوچ رہے ہو کہ تیکم ارشاد نے تم سے پرانا شرکنے کے باوجود بھی ہمدردانہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔“

”ارے.... تو آپ یہ بھی جانتے ہیں؟“

کیا وہ یہاں رک کر اُس نہ اسرار آدمی کو ٹھلاش کرے؟ مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اب تک نہیں موجود ہوتا۔ پھر ایسی صورت میں یہاں رکنا ہی فضول تھا۔ انور نے فیصلہ کیا کہ اُس وقت اُسے ٹھیک جانا چاہتے۔

اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس واقعہ کی اطلاع کرنے فریدی کو ضروری دینی چاہئے۔ چونکہ یہ کو بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آپکا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے گریں۔ تیکم ارشاد کے رویے نے اسے پھر الحسن میں ڈال دیا۔ آخر اس نے یہ جانے کی کوشش کیوں کی تھی کہ وہ اس مرض کا علاج جانتی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے اسے اسی پر مجبور کیا گیا ہو۔ انور اس خیال پر قائم نہ رہ سکا کیونکہ اگر وہ آدمی یہی چاہتا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود ہی اپنے پیچھے پولیس کو بھی لگانا چاہتا ہے۔ پھر آخر انور نے سے بیر کیوں؟

وہ سوچتا رہا لیکن کسی خاص تینجے پر نہ پہنچ سکا۔

اچانک ایک موڑ سائکل آکر فٹ پا تھے سے لگ گئی۔

”کیوں.... کیا نکلوادیے گئے؟“ اس نے رشیدہ کی طفر آیز آواز سنی۔

”اگر کچھ دیر اور نہ سبھرتا تو یہی حادثہ پیش آتا۔“ انور آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ”چلو.... یہ پچھے کیریز پر چلو۔“

رشیدہ کیریز پر چل گئی۔ انور نے سیٹ پر بیٹھ کر مشین اسٹارٹ کی اور پھر موڑ سائکل سڑک پر فرائے بھرنے لگی۔

”کیوں کیا تم اسی انتظار میں تھے؟“ رشیدہ نے اس کی پشت پر چکلیاں لیتے ہوئے کہا۔

”چین سے بیٹھو درندہ گاڑی فٹ پا تھے پر چڑھا دوں گا۔“

”یہ ایک شاندار ایڈوپنگ ہو گا۔ ضرور ایسا کرو۔“ رشیدہ نے سمجھ گی سے کہا۔ لیکن موڑ سائکل سڑک ہی پر دوڑتی رہی۔

”ہاں تو آج پھر اس پر فوہی کل کا سادو رہ پڑا تھا؟“ رشیدہ نے کچھ دیر بعد کہا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میرے اپنے ذرائع بھی ہیں۔“ رشیدہ اکٹھ کر بولی۔ ”اور یہ تقریب اس طرح ختم ہو گئی۔“ انور کچھ نہ بولا۔ موڑ سائکل فریدی کی کوئی کی طرف جاری تھی۔

کچھ دیر بعد وہ کوئی کی کپاؤڈ میں داخل ہوئے۔ پھاٹک ابھی بند نہیں کیا گیا تھا۔ انور موڑ سائکل کو پورچ میں لیتا چلا گیا۔

ویسے اگر اسے اپنی بڑیوں کا سفوف دیکھنے کی خواہ ہوتی تو دونوں ہاتھوں سے سر ضرور پیٹا۔ لیکن اس وقت وہ اس پاپ کو مجبوبی سے پکڑے رہنا چاہتا تھا جس کے سہارے اس نے سانحہ فٹ کی بلندی طے کی تھی اور جو مزید دس فٹ کی بلندی طے کرنے کے بعد اسے دوبارہ زندگی بچنے کا خاص من قرار۔ اس نے یہ خطرناک سفر تھا نہیں اختیار کیا تھا بلکہ شریک سفر "فادر ہارڈ اسٹون" بھی تھا۔ لیکن اب وہ کہاں تھا؟

جمید نے ایک مختنڈی سائنس لی اور پھر اور پر چڑھتے لگا کیونکہ "فادر ہارڈ اسٹون" کی عرصہ سے خر نہیں آئی تھی۔ حقیقتی عرصہ تین منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ مگر جمید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تین ہزار سال سے اس دیوار اور پاپ پر طبع آرٹی کرتا آیا ہو۔ صرف تین منٹ پہلے کرمل فریدی اور پنچھی گیا تھا اور شاید اتنی جلدی میں تھا کہ اسے بلٹ کر جمید کی خر لینے کی بھی مہلت نہ مل سکی تھی۔

جمید کسی نہ کسی طرح اور پہنچا۔ یہ تیری منزل کی سپاٹ چھٹ تھی۔ اور پنچھتے ہی وہ چت لیٹ گیا۔ اُس کا سینہ لوہار کی دھوکنی کی طرح چل رہا تھا۔

اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ حقن چاڑھا چاڑھا کر گانے لگے۔

ٹوئنکل ٹوئنکل لعل اشار

ہاؤ آئی وندر وہاٹ یو آر

تقریباً دس منٹ تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر نوچنے لگا۔ اب نیچے پنچھتے کی کیا صورت ہو گی لیکن پھر خیال آیا کہ اگر یہ کوئی دشوار مسئلہ ہوتا تو فریدی اُس کی راہنمائی کے لئے دہان ضرور رکتا۔ وہ نیچے ہی نیچے چھٹ کے ان کنارے کی طرف کھکھلے گا۔ جہاں سے وہ نیچے پنچھتے کے امکانات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اب اُس کے "فرخھیں" نے "جبر" کے چکر میں پڑا ہی چھوڑ دیا تھا۔

دیوار کے کنارے پنچ کر اُس نے نیچے جھانکا اور اُس کی باضھیں کھل گئیں کیونکہ صحن میں روشنی تھی اور نیچے پنچنا بھی نہیں آسان تھا۔

روشنی دیکھ کر وہ اس لئے خوش ہوا تھا کہ معاملات یونہی سے معلوم ہوتے ہیں ورنہ فادر ہارڈ اسٹون روشنی گل کرنا نہ بھولتا۔ وہ کارنس پر پیور رکھ کر دھم سے ٹھن میں کو گیا۔ اور کمرے کے اندر سے آواز آئی "واہ.....واہ..... دوسری افسوس میں بہت خوش قسمت ہوں۔"

"ہاں.... مجھے اس کا بھی علم ہے لیکن تم خواہ خدا اپنا وقت برپا د کر رہے ہو۔"

"نہیں جناب، میں اب تک شاہینہ سے دو ہزار روپے وصول کر چکا ہوں۔"

"لیکن اب شاید شاہینہ بھی تمہاری طرف رخ کرنے کی جرأت نہ کرے گی۔ ویسے مجھے تمہارے اس ناکارہ پن پر افسوس ہے کہ میک اپ کے باوجود بھی پیچاں لئے جاتے ہو۔"

"مجھے اس کا اعتراف ہے۔"

"خیر تم اب اس چکر میں نہ پڑو۔"

"لیکن اگر شاہینہ نے مجبور کیا تو؟"

"پھر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے کھل کر کرو۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"بیگم ارشاد سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکے گی۔"

"دیکھئے.... پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ بیگم ارشاد رات گئے بھی گھوڑا کاڑی میں شہر کی گیوں کے چکر کیوں لگاتی پھرتی ہے۔"

"نہیں میں ابھی اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"جرم سے زیادہ مجھے مجرم کی فکر ہے۔ اچھا بس اب تم گھر جاسکتے ہو۔" دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسہ منقطع ہو گیا۔

زرو پوش فرشتہ

مختنڈ کے پنچ کے لئے جمید نے کانوں کو رہاں سے جکڑ رکھا تھا۔ اس کے باوجود بھی اُس کے دانت نگر ہے تھے اور برف سے بھی زیادہ مختنڈ الہا اسے اپنے ہاتھوں میں چپکا ہوا سامنے ہو رہا تھا۔ اُس نے کارنس پر دونوں پیور جما کر نیچے دیکھا اور اُس کی روح فنا ہو گئی۔ وہ زمین سے تقریباً سامنہ فٹ کی بلندی پر تھا اور اطمینان کی سائنس لینے کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دس فٹ کی مزید بلندی طے کر کے چھٹ پر پنچ جائے۔

”جمید بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اس نے فریدی کو دیکھا جو کمر پر دونوں ہاتھ رکھے سید حاکم تھا اور اس کے ہونٹوں میں دبے ہوئے سرگار کا دھوال فضا میں لہریے بنا رہا تھا اور ایک دبل پتلا آدمی جس کے جسم پر زور دیگ کا الادھ تھا ایک آرام کر سی میں نیم دراز تھا۔

جمید پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور جیسے ہی وہ وہاں پہنچا دبلا پتا آدمی کر سی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں دھنڈتی تھیں اور گال پچکے ہوئے سے... لیکن عمر تین سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔

”خوش آمدید... اے متبرک فرشتے۔“ وہ جمید کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”میں براخوش قسمت ہوں۔“

جمید نے بھی بالکل اسی کے سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھائے لیکن دوسرے ہی لمحے میں ”آدمی پھر آرام کر سی میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی رنگت زرد تھی اور وہ خود نہیں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے فرشتے معلوم ہو رہا تھا۔

”کیا آپ مجھے اپنا نام نہیں بتائیں گے؟“ فریدی نے اس سے کہا۔

”میرا نام وقار اکتا ہے۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔

”میں آپ جیسے سنجیدہ آدمی سے سنجیدگی ہی کی توقع رکھتا ہوں۔“

”مجھے علم ہے کہ کسی کے متعلق کچھ معلوم کر لینا فرشتوں کیلئے ناممکن نہیں ہے۔“ وہ مسکلیا۔

”آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟“

”ابتداء آفرینش سے۔“

”میں اس وقت کہاں تھا؟“ جمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بڑھا دیا۔

”بھائی ماروت... تم تو میری ساتھ ہی اٹکائے گئے تھے۔“ اس نے جمید کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”کیا فرمایا...؟“ جمید اس کی طرف مڑ کر گھورتا ہوا بولا۔

”آہ... بھائی... کیا تمہیں یوں کی زہرہ یاد نہیں؟“

”میں جاپان تک کی زہر اؤں سے واقف ہوں۔ تم اپنا مطلب بیان کرو۔“

”یہ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں رہے؟“ اس آدمی نے کہا۔ ”مجھے تواب صرف اتنا ہی یاد ہے کہ زلزلہ آیا تھا اور چاہ باہل کے پرچے اڑ گئے تھے اور پھر ہوش میں آنے کے بعد تمہیں اپنے پہلو میں

نہیں پایا۔ اُف.... فوہ.... بھائی ماروت... کیا تمہیں وہ پیاس یاد ہے۔ ہماری زبانیں لگلی پڑیں تھیں اور پانی صرف ایک بالشت کے قابلے پر تھا۔“

”آہا....!“ جمید نے سر ہلا کر کہا۔ ”اور ہم اٹکے لٹکے ہوئے تھے۔“

”خدا کا شکر ہے... پیارے بھائی کہ تمہیں یاد تو آیا۔ اب تم کہاں رہتے ہو؟“ ”زہرہ کے گھر۔“ جمید فریدی کو آنکھ مار کر مسکلیا۔ لیکن فریدی شاید ان دونوں کی بکواس میں ذرہ برا بر بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

”کیا...؟“ وہ آدمی یک بیک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم زہرہ کے ساتھ رہتے ہو...؟“ ”ہاں.... اور مرنخ میر اسالا گلتا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو تم نے بد عہدی کی ہے ماروت... بہت برا کیا تم نے۔ میں تمہیں کبھی نہیں معاف کروں گا۔“

”وفلا فریدی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ” غالباً تمہارا نام ہاروت ہے۔“ ”اسی سے پوچھو۔“ اس نے جمید کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں....!“

”ہاں.... یہ مشر ہاروت ہیں۔“ جمید سنجیدگی سے سر ہلا کر بولا۔ ”ہم دونوں فرشتے تھے۔ یوں کی زہرہ کے عشق میں گرفتار ہوئے اور چاہ باہل کے قیدی بنا دیے گئے۔ آج کل میں جو تھے گاٹھتا ہوں اور یہ شاید بک باہنڈر ہیں۔“

”میں اُرل سے ہاروت ہوں اور اب تک ہاروت رہوں گا۔“ اس نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”میں اسے وضعداری کے خلاف سمجھتا ہوں کہ آج لفڑکا ہوں کل فرشتہ ہو جاؤں۔“

”تو پھر تم زہرہ کے معاملے میں مجھ سے بھگنا نہیں کرو گے۔ کیوں....؟“ جمید نے کہا۔ ”ختم کرو۔“ فریدی جھلانے ہوئے لجھے میں بڑھا دیا۔ پھر اس آدمی سے بولا۔ ”زہرہ تمہیں مل جائے گی میں وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن تم ہم فرشتوں کی آمد کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے۔“

”ہاں....!“ جمید فریدی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ بھائی عزرا تکلیں ہیں۔“ ”ولا یکٹھ سر....!“ وہ جھک کر فریدی سے مصافی کرتا ہوا بولا۔ ”مجھے کیا پڑی ہے کہ میں کسی سے تذکرہ کروں۔“

فریدی نے جمید کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

”آپ حضرات کوں سی شراب پسند کرتے ہیں؟“ زرد پوش فرشتے نے ان سے پوچھا۔

اسی انداز میں بڑا تارہ۔ ”شفق اُس کے گھاؤں کو چھوڑی تھی۔ ایک سہر اب جو اُس کے قریب سے گزر رہے تھے اپنے پروں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ اور..... ہاتھوں کے پھول ہوا میں تیر رہے تھے۔ گو غفرغی۔ غریمکی۔ غردو حال۔ غی۔!“ پھر وہ صرف بیویوں ہو گیا بلکہ اُس کی گردان بھی ایک طرف ڈھلک گئی۔ فریدی نے اٹھ کر اُسے ہلا یا جلا یا لیکن اُسے ہوش ہی نہیں قہ۔

پرانی شراب آہستہ آہستہ حمید کے ذہن پر سکھ جمارتی تھی لیکن ابھی اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہاتھ پر تیر قابو میں نہ رہے ہوں۔

اُس نے دیکھا کہ فریدی گلاس اور بوتل اٹھا اٹھا کر اُسی الماری میں رکھ رہا ہے جس سے وہ نکالے گئے تھے۔ پھر اُس نے بے ہوش فرشتے کو بھی اٹھا کر مسہری پر ڈال دیا اور حمید کا گریبان پکڑ کر جھکا دیا ہوا بولا۔ ”یہ شراب تیز اور پرانی معلوم ہوتی ہے اگر تم اونہے ہو گئے تو کیا ہو گا؟“ ”میں بھی فرشتہ ہوں اور اسی فرشتے کے ساتھ دفن ہو جاؤں گا۔“ حمید نے مسہری کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ بخت۔ اب تم یہاں سے نکلو گے کیسے؟ کیا تم پاپ کے سہارے نیچے اتر سکو گے۔“ ”ہرگز نہیں۔“ حمید مٹھیاں بیچپنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ ”نمکن۔۔۔ میں پاپ ہی نہ پکڑ سکوں گا۔“

”جھٹم میں جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور کمرے کی تلاشی لینے لگا یہاں تین کمرے تھے۔ ایک چھوٹا سا صحن تھا اور ایک برآمدہ۔۔۔ ساز و سامان سے زرد پوش فرشتے کوئی کم حیثیت آدمی نہیں معلوم ہوتا۔

حمدی فریدی کے ساتھ لڑکھڑا پھر تارہ۔ اور اب اس کے ذہن میں بے ربط اور اوٹ پلائگ خیالات چکرانے لگے تھے۔

”مجھے یوں ان کی زبرہ کے والد سے ملا تھا۔“ اُس نے فریدی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”چچھے ہٹو۔۔۔!“ فریدی اُسے دھکا دیا ہوا بولا۔

”اڑے۔۔۔ وال۔۔۔ میں کمزور ہوں کیا۔“ حمید آستین چڑھانے لگا۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ پر ٹھکلی شراب نے اُس کا بھیجا گھوپڑی کے اوپر لا رکھا تھا۔

”میں بہت بُری طرح خبر لوں گا۔“ ”میں اس سے بھی بُری طرح پیش آؤں گا۔“ حمید سینہ ٹھوک کر جواب دیا۔

”جو بھی وقت پر مل جائے۔“ فریدی بالکل اسی انداز میں جماہی میں کر بولا چھے چکچو۔“ شراب کا عادی ہوا اور دیر سے اُسے شراب نہ میر آئی ہو۔

”کیا میں ایک بہت پرانی اور پر ٹھکلی شراب پیش کرنے کا فخر حاصل کر سکتا ہوں؟“ ”میں مشکور ہوں گا۔ لیکن میری عادت ہے کہ اپنے ساتھ پینے والوں کے لئے میں ہی مکن کرتا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہو گی اگر میں اپنے مہماں کی خواہشات کا احترام کر سکوں۔“ زرد پوش فرشتے نے کہا اور اٹھ کر ایک الماری کھوٹی۔ پھر ذرا ایسا دیر بعد میز پر تین گلاس ایک بوتل اور سوڈے کا سائنس نظر آنے لگے۔

حمدی فریدی کو جھیڑت سے دیکھ رہا تھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ ویسے اس وقت اُس کی آنکھیں ملقوں سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ جب فریدی تینوں گلاسوں میں شراب ڈال چکنے کے بعد سائنس سے سوڈے کی بوجھاڑیں کر رہا تھا۔

تینوں نے گلاس نکلایا اور ایک دوسرے کو ترقی و خوشحالی کی دعائیں دے کر گلاسوں کو ہونوں سے لگایا۔ پہلے ہی گھوٹت نے حمید کی آنکھوں پر ٹھوک کر ماری اور اُس کی کپیٹیاں گرم ہو گئیں۔ شراب واپسی بہت پرانی اور تیز تھی۔ اُس نے دیکھا کہ زرد پوش فرشتے نے دو ہی تین سانسوں میں اپنا گلاس ختم کر کے میز پر چڑھ دیا۔ حمید نے بھی اُسی کی تقلید کی لیکن اُس کے سینے کا جو حال تھا شاید پہلے کبھی نہیں ہوں۔ وہ اپنا گلاس میز پر چڑھ کر فاتحانہ انداز میں فریدی کی طرف مڑا جو خونخوار نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔

اب حمید نے دیکھا کہ فریدی کا گلاس جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ شاید اُس نے ایک ہلکی سی چکی بھی نہیں لی تھی۔

حمدی کے حواس غائب ہو گئے۔ وہ نہ جانے کس دھن میں کچھ بیٹھا تھا کہ فریدی نے اپنے لئے بھی شراب پینے ہی کی غرض سے اٹھ لی ہے۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ وہ کسی درندے کی طرح غایا۔ حمید نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہٹکا کر رہ گیا۔ نہ ذہن ساتھ دے رہا تھا اور نہ زبان۔

”وہ ضرور آئے گی۔ مجھے یقین ہے۔“ زرد پوش فرشتے کر سی کی پشت سے نکا ہوا بڑا رہا تھا اور اُس کی آنکھیں چھٹ سے گلی ہوئی تھیں۔

”صدیاں گذریں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں نے اُسے جھیل میں نہاتے دیکھا تھا۔“ زرد پوش فرشتے

فریدی پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔
”بس دم نکل گیانا..... ہاہا.....!“ حید نے جھوٹتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

لیکن فریدی نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا سکتے نہیں۔ حید کی کھوپڑی آؤٹ ہی ہوتی تھی اور اس نے بھی فریدی کی تقلید میں چیزیں اٹھا اٹھا کر ادھر کی اوخر کرنی شروع کر دیں۔ میٹھیں سے گھڑی اٹھائی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کان سے لگا کر اس کی ”مک بک“ سٹار بہ کچھ دیر بعد خود بھی ٹک ٹک شروع کر دی۔ بالکل اسی انداز میں جیسے گھڑی کو چڑھا رہا ہو۔

”سالی کو ٹھیک سے چلانا بھی نہیں آتا۔“ اس نے جھلا کر کہا اور گھڑی کو فرش پر ٹھیڈ دیا۔
”یہ کیا بیہودگی ہے۔“ فریدی مڑ کر غایبا۔

”اے بڑے بھائی تم اپنا کام کرو۔“ حید دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر بولا۔ ”ورت مجھے خواہ نخوا
غصہ آجائے گا۔ کیا تم مجھے الٹ کھینچتے ہو؟“

”اگر تم نشے میں نہ ہوتے تو میں تمہاری کھال کھینچ لیتا۔“
”میں نشے میں نہیں ہوں۔ ذرا کھینچ تو کھال۔ میں بھی دیکھوں کہ کتنے طاقت ور ہو۔“

فریدی نہ اسامنہ ہٹائے ہوئے ایک سوٹ کیس پر جکپڑا اتنے میں حید کی نظر مبسوط کی الماری کے بڑے آئینے پر پڑی اور وہ ٹھنک گیا۔ پھر مٹھی باندھ کر دانت پیٹتا ہوا آئینے کی طرف بڑھا۔ ساتھ میں بڑا بھائی جا رہا تھا۔ ”یو ایٹھیٹ... الو کا پٹھا... سالا ہمارا بھیں بدکلر آیا ہے تم۔“
”تحمڈ...!“ اس کا ماکا آئینے پر پڑا اور پھر اس کے چہرے پر تینی بکھر گئی کیونکہ آئینہ اتنا معمولی بھی نہیں تھا کہ ایک آدھ گھونسہ بھی نہ برداشت کر سکتا۔ ویسے کوئی حید کے دل سے پوچھتا کہ اس کے پنج کی ہڈیوں کا کیا حشر ہوا تھا۔

”اے کیوں پا گل ہوا ہے حید کے پنج کیوں شامت آئی ہے۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں اپنی توہین نہیں برداشت کر سکتا۔ تم خود حید کے پنج۔“ حید نے کہا اور الماری سے کپڑے نکال کر اُن کی دھیان بکھیرنے لگا۔

”اے یہ کیا کر رہا ہے۔“
”مزے کر رہا ہوں۔“ حید کا جواب تھا۔

”اچھا تو کرو مزے۔“ فریدی اُسکی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ حید نے چھپٹ پڑا چاپا لیکن فریدی نے اتنی بھرتی سے چپر اس الماری کے دوسرا ہی لمحے میں وہ داہنے شانے کے مل زمین پر تھا۔

”اے باپ رے۔“ وہ کسی زخمی بیتل کی طرح کراہا۔ لیکن اُسے پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ فریدی نے دو منٹ کے اندر ہی اندر اُسے بے بس کر دیا۔ اُس کی تائی کھول کر اُس نے اُس کے دونوں پیر باندھ دیئے تھے اور حید زمین پر بیٹھا گریں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب گریں کسی طرح نہ کھلیں تو اُس نے کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیا۔

بللو مت رو بیہاں آنسو بہانا ہے منع
ان قفل کے قیدیوں کو غل چاہا ہے منع

او بللوں کے پیچے میں تمہارے حلقوں میں کپڑا نہ نہیں دونوں گا۔“ فریدی پیر چیخ کر بولا۔ ”تم مجھے رونے بھی نہیں دیتے.... ہائے ہائے رے ظالم زمانہ۔“ اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر ہاکن لگائی اور فریدی نے آگے بڑھ کر اُس کے گالوں پر خپھر سید کرنے شروع کر دیئے۔ ”اے.... اے.... وہ بھئی۔“ حید ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہ ہوئی اور اُس کے دونوں گال سرخ ہو گئے۔

”مارلو.... مارلو.... اچھی طرح مارلو.... اللہ تمہیں غارت کرے گا.... جیسے تم نے ایک بیوہ کا دل دکھایا ہے۔“ حید بچھ بچھ یوہ ہی کے سے انداز میں بللا کر بولا اور فرش پر لیٹ کر چہرہ بازووں میں چھپا لیا۔ فریدی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

حید اُس کے لئے اس وقت ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اول توہہ اُس کے کام میں حارج ہو رہا تھا اور دوسرے کچھ دیر بعد دوسری صورت میں دبال جان بننے والا تھا۔ وہ دونوں اسی لئے عمارت کی پشت سے اندر داخل ہوئے تھے کہ صدر دروازے سے داخلہ ناممکن تھا۔ اور اب بھی باہر نکلنے کے لئے صرف وہی راستہ استعمال کیا جا سکتا جس راستے سے وہ بیہاں تک پہنچ چکے تھے۔ صدر دروازہ باہر سے مقفل تھا اور اُسے کھلوانا ناممکن تھا میں سے تھا۔ اگر فریدی کو علم ہوتا کہ حید سے شراب پینے کی حماقت سرزد ہی ہو جائے گی تو وہ اُسے پہلے سے اشارہ کر دیتا۔ اُس کا مقصد توڑا صل اُس زرد پوچھ فرشتے کو بے ہوش کر کے بیہاں کی ٹلاٹی لینا تھا۔ اُس کے گلاس میں اُس نے ایک بہت ٹھا سر لیٹ الاٹر قسم کی خواب آور دوام لائی تھی۔ حید کو اُسی حالت میں چھوڑ کر وہ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کچھ اسی قسم کا آدمی تھا۔ اسے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ پانچ منٹ بعد کیا ہو گا۔ اُس نے ایک صندوق کھول دالا اور اُس میں بر کھی ہوئی چیزیں لئے پلٹنے لگا۔ اس میں زیادہ تر گور توں کے تھاں کی چیزیں تھیں۔ بیہاں کئی سوٹ کیسوں میں بھی اُسے زنانہ استعمال کے

میوسات ملے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں کوئی عورت بھی رہتی ہے تو اسے اس کا علم پڑے سے کیوں نہیں ہوا۔ اُسے جو کچھ بھی اطلاعات ملی تھیں وہ صرف اتنی ہی تھیں کہ یہاں ایک فاتح اعقل آدمی رہتا ہے۔ خبر گیری کے لئے دو آدمی ہیں جو مختلف اوقات میں اُس کی دلکشی بھال کر کے اُسے مکان میں مقفل کر جاتے ہیں۔ اس وقت بھی اُسے معلوم ہوا تھا کہ وہ مکان میں تھا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو صدر دروازے کا قفل آسانی سے کھول سکتا تھا مگر شاید وہ اپنی آمد کے نشانات نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اُس نے دوسرے ہی طریقے کو ترجیح دی تھی۔ دیے اب وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ متعلقہ لوگوں کو اس خانہ حلاشی کا علم نہ ہو سکے گا کیونکہ حید نے نئے کی حالت میں وہاں کچھ اسکی اتری پچیلادی تھی جس کا ازالہ تقریباً ممکن نہیں تھا۔

دفعۂ حید نے سر اٹھا کر کہا۔ ”اللہ کرنے تمہاری قبر سے دھواں اٹھ۔“ تن تن کیڑے پڑیں....!“ نہ جانے اُس کے ذہن میں کی یہودہ کا تصور کہاں سے آگھسا تھا۔

”خدا کرے مرتے وقت کلمہ نہ نصیب ہو.... میں جنم جملی..... یہہہ..... یہہہ..... یہہہ.....!“ وہ عورتوں کے سے انداز میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

شعبدوں کا جواب

فریدی کو بیساختہ بھی آگئی اور وہ مژ کر بولا۔ ”در اتم ہوش میں آجائو تو پھر مزان پوچھوں گا۔“

”چھیڑو گے تو شور چادوں گی۔“ حیدر دتا ہوائک کے مل بولا۔

فریدی جلد سے جلد پورے مکان کو دیکھا ڈالا تھا۔ ابھی ایک کرہہ اور باقی تھا وہ حید کو وہیں چھوڑ کر تیرے کرے میں چلا آیا لیکن بمشکل تمام ایک منٹ گذر ہوا کہ اُسے ایک عجیب قسم کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی داہنی جاتب والی کھڑکی کے پاس لرزنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کوئی اُسے کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

فریدی آہستہ پیچھے ہٹتا ہوا دروازے کے قریب آگیا اور اُسے بہ آہنگی بند کر کے وہیں کھڑا رہا لیکن اُس کی ایک آنکھ خود کار قفل کے سوراخ سے لگی ہوئی تھی اور داہنہ ہاتھ بیب میں پڑے ہوئے ریو الور پر تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کوئی بیٹا خوار کے گھات میں ہو۔

۱۰۰۰ اُس نے روشنی نہیں مل کی تھی اور قفل کے سوراخ سے بہتی ہوئی کھڑکی صاف دکھائی دے تھا۔ اُس نے ریو الور پر تھا۔

رسی تھی۔ دفعۂ اُس کے دونوں پاٹ کھل گئے اور ایک آدمی اندر کوڈ آیا۔ اُس کے جسم پر سیاہ کپڑے تھے اور اُس نے اپنا چہرہ بھی سیاہ نقاب میں چھپا کر تھا۔

اُس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر بڑی اختیاط سے اُسی دروازے کی طرف دیکھنے لگا جس کے قریب فریدی کھڑا ہوا تھا۔

فریدی نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ آنے والا یا تو کوئی امراضی تھا یا انہائی بیباک آدمی جس نے روشنی مل کرنے کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ ویسے اُس کا داخلہ بھی اُسی راستے سے ہوا جس سے فریدی اور حیدر یہاں تک پہنچ چکے تھے۔ یہ دونوں تو سیدھے چھٹ پر نکل آئے تھے لیکن اس آنے والے نے چھٹ کی طرف جانے کی بجائے کارنس پر چل کر کھڑکی تک پہنچ کی کوشش کی تھی اور اُس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

فریدی ایک طرف ہٹ کر دیوار سے چک گیا۔ اُس نے صحن کی روشنی اُسی وقت گل کر دی تھی جب ملاشی کا آغاز کیا تھا۔

آنے والے نے بہ آہنگی دروازہ کھولا اور صحن میں آگیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں فریدی کے روپ الور کی نال اُس کی گردن سے جاگی۔

”آپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“ اُس نے آہستہ سے کہا اور نقاب پوش کے ہاتھ بے اختیارانہ طور پر اوپر اٹھ گئے۔

”چلو... آگے بڑھو...!“ فریدی ریو الور کی نال پر تھوڑا زور صرف کرتا ہوا بولا۔

نقاب پوش نے بے چون و چرا ٹھیل کی۔

”اندر چلو...!“ فریدی بولا۔ وہ اُس کرے کے دروازے پر تھے جہاں زرد پوش فرشتہ بے ہوش ڈا تھا۔ نقاب پوش نے پیر سے دروازے کو دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا۔

لیکن فریدی کی حریرت کی کوئی انتہا رہی کیونکہ سہری پر زرد پوش فرشتے کی بجائے کیٹیں حید پڑا ہوا تھا اور زرد پوش فرشتہ سرے سے غائب۔

ابھی اُس کی حریرت دور نہیں ہوئی تھی کہ اُسے دوسرے حادثے سے دوچار ہوتا پڑا۔ یعنی بے خبری میں کسی نے اُس کے ہاتھ سے ریو الور چھین لیا۔ وہ بڑی تیزی سے مزا لیکن بیک وقت تین ریو الوروں کی نالیں اُس کے سینے سے آ لگیں۔

”ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“ بولنے والا لمحے سے غیر ملکی معلوم ہوا تھا اور جملہ انگریزی میں ادا کیا گیا تھا۔ فریدی نے ہاتھ اٹھا دیے۔ ساتھ ہی اُسے اپنی پشت پر قہقہہ سنائی دیا۔

وہ نقاب پوش نہیں رہا تھا جس کی گردن پر کچھ دیر پہلے فریدی نے روپ اور رکھ دیا تھا۔
”ہلو..... مائی ڈیزیر... ہاؤ ڈیو ڈو۔“ اُس نے فریدی کی کمر تھپ تھپ کر کہا۔ ”آو... آؤ اندر
آؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو۔ تمہارا اسنٹ گھری نیند سو رہا ہے۔ اس نے اُس کی نیند میں خلل
پڑنے کا ندیشہ نہیں ہے۔“

فریدی چپ چاپ کرے میں داخل ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ نقاب پوش نے آرام کر سی کی طرف اشارہ کیا۔

”اور اگر میں انکار کروں تو....؟“ فریدی مسکرا کیا۔

”تب پھر تم سے زیادہ بدجنت آدمی روئے زمین پر نہ ملے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر ڈریٹھ نے آج تک
اتنی مہلت کسی کو نہیں دی۔“

”اوہ.... تو تم ڈاکٹر ڈریٹھ ہو؟“

”اور تمہیں اس پر حیرت ہے؟“

”نہیں حیرت کیوں ہوتی۔“ فریدی نے لاپرواںی سے کہا۔ ”اس آدمی کے ہاتھوں زک
الخانے میں مجھے قطعی شرمندگی نہ ہو گی جو دوبار میرے ہاتھوں ذلیل ہو چکا ہے۔“

”آہا.... وہ میری تفریح تھی کرتی۔“

”اوہ یہ میری تفریح ہے۔“ فریدی نے لاپرواںی سے شانوں کو جنمیں دی۔

”خیر مجھے معلوم ہے کہ تم بہت دلیر اور چالاک ہو۔“ نقاب پوش نے سرد لہجے میں کہا۔
”لیکن تم میرے اصول سے واقف نہیں ہو۔ میں جب بھی کسی نئی سر زمین پر قدم رکھتا ہوں اپنے
لئے لا تعداد خطرات خود ہی پیدا کرتا ہوں تاکہ خود کو وہاں کے ماحول سے ہم آہنگ کر سکوں۔ کیا
سچھے.... ورنہ جانتے ہو میرا ایک ہلاکا سا اشارہ تمہاری موت کیلئے کافی ہوتا۔ کیا میری سلسلہ جید
کے بازو میں کوئی ایسی زبری سی سوئی چھو سکتی تھی جس سے اُس کی موت وہیں واقع ہو جاتی۔“

”چھو سکتی تھی۔“ فریدی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ تم دونوں ابھی تک زندہ ہو؟“

”یہی کہ ہم دونوں نے فی الحال مر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“ نقاب پوش نے مسکرا کر بولا۔

”ہم تمہیں الوداع کہنے ہوائی اُذی ہے پر ضرور آئیں گے۔“

”تم غلط سمجھے یہ سر زمین مجھے بہت پسند آئی۔“ یہاں دولت حاصل کرنے۔

موقع دوسری بیکھوں سے بہتر اور زیادہ ہیں۔ لہذا میں اب تم جیسے کاموں کو اپنی راہ سے ہٹا دیا
چاہتا ہوں۔“

”مگر اُس نسختی سی چھائی کے لئے کیا کرو گے جو تمہارے ذہن میں ہر وقت کھلتی ہے۔“
”غالباً تمہارا اشارہ بھی طرف ہے۔“ نقاب پوش بے تحاشہ ہٹنے لگا۔

”ارے وہ میرے دربار کا مخراہ ہے۔“

”بہت خوب۔“ فریدی اس جملے سے محفوظ ہوا۔

”ادھر سنو....!“ دفلتا نقاب پوش کا لہجہ بدل گیا۔ ”تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔ میری ایک
معمولی سی چال بھی تمہاری سمجھ میں نہ آسکی۔ تم میری سلسلہ کے پیچھے دوڑتے رہے۔ تم نے یہ
نہ سوچا کہ وہ کیپٹن حیدر کے بازو میں زبری سی سوئی چھوٹے کے بعد بھی اعلانیے کیوں گھومتی پھر رہی
ہے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ ویسا ہی ایک تجربہ اُس کرامہ روپورٹر کو کیوں ہوا؟“

”اگر کرامہ روپورٹر انور کو بھی ایسے ہی واقعے سے دوچار نہ ہونا پڑا ہوتا تو میں اس کے متعلق
ضرور سوچتا۔“ فریدی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تم لوگ میری سلسلہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے اور تمہیں پڑھیوں نے بتایا
کہ یہاں ایک پاگل آدمی رہتا ہے اور اُس کے متعلقین اُسے مغلل رکھتے ہیں۔“ نقاب پوش مزہ
لے لے کر کہتا رہا۔ ”پھر ہم نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ تمہارا اسنٹ گھری بڑا حصہ ہے۔ اُس
نے تمہارے لئے دوہری پریشانیاں پیدا کر دیں۔ اب تم سوچ رہے ہو گے کہ اگر میں کسی طرح
نکل بھی جاؤں تو اس لگدھے کا کیا ہو گا۔“

”مائی ڈیزیر ڈاکٹر ڈریٹھ۔ تم حیرت انگیز آدمی ہو۔“ فریدی نے متھیرانہ انداز میں کہا۔ ”تم نے
میرے دل کی بات کہہ دی لیکن سنودوست تمہیں شاید اس کا علم نہیں ہے کہ میں عرصہ سے
اُس کی موت کا خواہاں ہوں۔“

”میرے لئے بالکل نئی اطلاع ہے۔“

”ہاں.... مگر تمہارا رویہ بڑا بزرگ لاءِ ہے۔ میں بالکل نہتا ہو چکا ہوں۔ اس کے باوجود بھی
میری طرف چارپاؤ اور اٹھے ہوئے ہیں۔“

”اصولاً تو غلط نہیں ہے۔“

”نہ ہو گا۔ مگر مجھے الجھن ہوتی ہے۔ اپنے ایک آدمی سے کہو کہ میری جامہ تلاشی لے ڈالے۔“
”کیوں...؟“

”تاکہ تم لوگ میری طرف سے مٹھن ہو کر یو اور اپنی جیسوں میں رکھ لو۔“
”کیا یہ ضروری ہے کہ ہم وہی کریں جو تم چاہتے ہو۔“

”یقیناً اخلاق کا توہین تقاضہ ہونا چاہئے کہ تم اس وقت میری ہر خواہش پوری کرو کیونکہ تمہارے ہی قول کے مطابق ہم ہوڑی ہی دیر کے مہمان ہیں۔ جب کسی مجرم کو سزا موت دی جانے لگتی ہے تو اُس کی آخری خواہش بھی پوری کرنی پڑتی ہے۔“

”نقاب پوش کچھ دیر خاموش رہا پھر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔
”اس کی جامہ تلاشی لو۔“

جامعہ تلاشی شروع ہو گئی لیکن فریدی کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہ ہوئی جس سے ان کو خطرہ ہوتا۔

فریدی آرام کر سی پر بیٹھ گیا۔ اور کچھ دیر بعد بولا۔ ”ہاں... کہو... اب کیا کہتے ہو؟“
”کچھ نہیں۔ ابھی تم نے فتح کے سلسلے میں مجھ پر طنز کیا تھا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اُس وقت تک زندہ رکھا جائے جب تک کہ تم فتح کا نجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لو۔“

”مگر ڈاکٹر ڈریٹھ میں اب زندہ نہیں رہتا چاہتا۔“
”میں...؟“

”بس یو نہیں۔ دل نہیں چاہتا۔ اسکی نکست کے بعد کون زندہ رہتا پسند کرے گا جیسی اس وقت مجھے نسبت ہوئی ہے۔“

نقاب پوش ہنسنے لگا لیکن فریدی کے چہرے پر بدستور مایوسی نظر آتی رہی۔

”نہیں....!“ نقاب پوش بولا۔ ”تمہیں اُس وقت تک ہماری قید میں رہنا پڑے گا جب تک کہ میں فتح کو ایک حیر کریں کی طرح مسل نہیں ڈالتا۔“

فریدی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی جیسی گھڑی نکالی اور اُسے کان سے لگاتا ہوا بولا۔ ”یہ بیکٹ بھی آج خلاف معمول بند ہو گئی۔ کیا چجھ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے۔“

فریدی اُس میں چالی دینے لگا پھر ڈاکٹر ڈریٹھ سے بولا۔ ”کیا وقت ہوا ہے؟“

نقاب پوش نے اپنی کلاں کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈھانی۔“
”مشکریہ۔“ فریدی اپنی گھڑی کی سویں کو حرکت دیتا ہوا بولا۔ ”مگر دوست ڈریٹھ یہ پال آدمی کوں تھا۔ میں اس میں بہت شدت سے دچپی لے رہا ہوں۔“

”سو نے کی چیز۔“ نقاب پوش نے قہقہہ لگایا۔ ”بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتایا جاتے۔“

”میں آدمی کے خون کی ہربوند سے ایک توہ سوٹا بناتا ہوں۔“

”تم واقعی بہت باکمال آدمی ہو۔ بہت زیادہ گری یہ حقیقت ہے کہ ایک حقیر سے کیڑے فتح نے تمہاری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ تم دوسروں کو بیک میل کر کے روپیہ انشٹھے ہو اور وہ تمہیں بیک میل کر کے اُس میں حصہ لگایتا ہے۔“

”شیر کا جھوٹا گیدڑیں لکھاتے ہیں۔“ نقاب پوش نے اپنے شانوں کو لا پر واٹی سے جبنش دی۔

”ہاں بھی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔“ فریدی اُسے تھیسین آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”تم آدمیوں کے ساتھ ہی ساتھ الفاظ کے بھی ہو کاری ہو۔“

”ہاں....!“ نقاب پوش نے سر ہلا کر کہا۔ پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ”ان دونوں کو قید کر دو۔“

”کیا یہیں قید کرو گے۔“ فریدی نے حرمت سے کہا۔

”قطعاً.... لیکن۔“ وہ معنگیکار اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”قید تو ہی ہو گی جسمانی طور پر تم بالکل آزاد ہو گے۔ باہر قفل نہیں ڈالا جائے گا۔ تم باہر جا سکو گے لیکن واپسی یہیں ہو گی۔“

”اوہ....!“ فریدی نے حرمت سے کہا۔ ”میں بالکل نہیں سمجھا ڈاکٹر ڈریٹھ۔“

”تم دونوں کو ایک خاص قسم کے انگلشن دیئے جائیں گے اور تم اپنی پچھلی زندگی کے متعلق سب کچھ بھول جاؤ گے۔“

”بہت دلچسپ۔“ فریدی اپنی جیسی گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا پھر یہ بیک کھڑے ہو کر اُس نے گھڑی چھٹ کی طرف اچھا دی اور قلب اُس کے کہہ لوگ سمجھلتے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور تھیز قسم کی روشنی سے اُن کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

”حیدر چنگ مار کر اٹھ بیٹھا۔ شاید اُس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔“

چاروں نقاب پوش بے حس و حرکت ہو گئے تھے اور کمرہ جنم کا نمونہ بنتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسی وہ کمی نظر نہ آنے والی آگ کی لپٹوں میں گھر گیا ہو۔

”ہاں ڈاکٹر ڈریٹھ....!“ فریدی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”اب آؤ۔ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

تمہارے شعبدے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ لیکن کیا اس کا جواب پیش کر سکو گے؟“

گری کی شدت سے پریشان ہو کر وہ چاروں اپنے کپڑے نوپنے لگے اور ذرا ہی سی دیر میں اُن کے جسموں پر زیر یار ماموں کے علاوہ اور کچھ نہ رہ گیا۔ اُن کی نقاہیں بھی دور پڑی ہوئی اُن کو من پڑھا رہی تھیں لیکن اُس کے برخلاف فریدی اور حیدر پر اس گرمی کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

حیدر مسہری سے اٹھ کر فریدی کے پاس آگھڑا ہوا اور اُن چاروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھ رہا تھا۔

”یہ رائے شیخر کی کوٹھی والے دھوکیں کا جواب ہے ڈاکٹر ذریث۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔
”ہمیں یہ ڈاکٹر ذریث ہے۔“ حمید آنکھیں مل کر انہم بہمنہ آدمیوں کو گھورتا ہوا بولا۔
”ہاں... یہ ڈاکٹر ذریث ہے۔“ فریدی نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
”ارے تو پھر... باندھ لوتا... کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں ہم۔“
”نہیں....!“ فریدی نے سرد لبجھ میں کہا۔ ”ذریث کو اپنی صلاحیتوں پر برا غرور ہے۔ اس
نے اپنی راست میں ہمیں ڈھیل دے رکھی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے لئے دیدہ دانت خطرات
پیدا کر کے اُن میں سے صحیح و سلامت نکل جانے کو تفریق سمجھتا ہے۔ میری سٹگلشن والا جال
ہمیں چھاننے ہی کے لئے اُس نے بچھایا تھا... لہذا... حمید صاحب فی الحال اُسے باندھ لینے کی
ضرورت نہیں ہے۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“
لیکن فریدی حمید کی طرف توجہ دیئے بغیر ڈاکٹر ذریث سے بولا۔ ”میاں تمہارے جسم میں
اتنی سکت رہ گئی ہے کہ ہم پر حملہ کر سکو۔“
ڈاکٹر ذریث کچھ نہ بولا۔

”اتنی سکت نہ ہوگی۔ اس لئے میں تمہیں اس حال میں گرفتار نہیں کر سکتا۔“
”اے جناب... اے جناب۔“ حمید دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ ”آپ کسی جاسوسی ناول کے
ہیر و نہیں ہیں، ہوش میں آئیے۔“
”میں ہوش میں ہوں۔“ فریدی نے اپنے شانے کو جبش دے کر کہا۔ ”اگر تم بے ہوش نہ
ہوتے تو میں یہ شعبدہ ضائع کے بغیر ہی ڈاکٹر ذریث پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ مگر اس کا ایک شعبدہ مجھ پر
ادھار بھی تو تھا۔“

”میں شاید اب بھی نہیں میں ہوں۔“ حمید نے بڑا کر اپنے بازو میں چکلی لی اور ”سی“ کر کے
رہ گیا۔ اُسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین بھی کیسے آتا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ڈاکٹر
ذریث جیسے مجرم پر قابو پانے کے بعد اُسے چھوڑ دیتا۔

”آپ پھر غور کیجئے۔“ حمید نے فریدی کا بازو چھو کر کہا۔
”آؤ چلیں۔“ فریدی اُس کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتا ہوا بولا۔
”میں.... میں۔“ حمید پھر آنکھیں پھاڑ چھاڑ کر فریدی کو دیکھنے لگا اور آہستہ سے بولا۔“

میرے بعد آپ نے بھی پیلی تھی؟“

”آپے چل...!“ فریدی نے دروازے کی طرف اُسے دھکایا۔

و دونوں باہر آئے اور فریدی نے دروازہ بند کر کے کہا۔ ”اپنے کان تیزی سے ملو۔“

اور وہ بھی دونوں ہاتھوں سے اپنے کان ملنے لگا۔

حمید بے نی سے اپنے کان ملتا ہوا منٹا لیا۔ ”خود نئے میں ہوں تو کوئی بات نہیں۔ ہم سے
غلطی ہو جائے تو جہنم میں جھوکنے پر تیار ہوئے۔“

”کچھ گرمی آئی کانوں میں؟“ فریدی نے پوچھا۔

”لا جوں ولا قوتہ...!“ حمید نے جھلا کر کہا اور اپنے دونوں ہاتھ نیچے گرا دیئے لیکن دونسرے
ہی لمحے میں فریدی حمید کے کان مسل رہا تھا۔

”ارے خدا کے لئے چھوڑ دیئے۔“

”کانوں میں گرمی آئی یا نہیں؟“

”کتاب ہو گئے سالے۔ بس اب چھوڑ دیئے۔ یا خدا۔“

”ٹھیک ہے آؤ۔“ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ دروازے اب باہر
سے مقفل نہیں تھے۔ وہ زینے ملے کرتے ہوئے نیچے آئے اور اُس سمت پیدل چلنے لگے جہاڑا۔

فریدی نے اپنی کار چھوڑی تھی۔ حمید اب نئے میں نہیں تھا۔ لیکن فریدی کے اس رویہ نے اُسے
باگل کر دیا تھا۔

”یہ کیا کیا آپ نے؟“

”وہی جو ہونا چاہئے تھا۔“ فریدی نے لا پروائی سے کہا۔

”آپ نے اتنے بڑے مجرم کو چھوڑ دیا۔“

”گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟“

”کیا مطلب...?“

”وہ ڈاکٹر ذریث نہیں تھا۔ جس طرح وہ لوگ مجھے مر عوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اُسی
ٹھنڈاگر میں بھی... حمید صاحب میں بھی آدمی ہوں۔ اور دنیا کا ہر آدمی دوسرے پر اپنی برتری
ضور جتنا چاہتا ہے۔“

”لیکن آپ کسی ایسے آدمی کو کیا کہیں گے جو موقعہ سے فائدہ نہ اٹھائے۔“

”احمق....!“

”اس معاملے میں اپنے متعلق کیا خیال ہے؟“

”میں بھی ایک بہت بڑا حق ہوں۔ یہ حافظت نہیں تو اور کیا ہے کہ میں نے بھی انہیں ایک شعبدہ دکھا کر چلتا کر دیا۔ اگر تم اس کا تذکرہ دوسروں سے کرو تو اس تذکرے کو لطفیہ نہیں گے۔“

”خداء کے لئے مجھے بتائیے۔ کیا آپ نے پی تھی؟“

”نہیں فرزند..... میں کبھی نہیں پیتا۔“

”پھر مجھے آپ کے صحیح الدماغ ہونے پر شہید ہے۔“

”میں نہیں کہتا کہ تم اپنا شہید دور کر دو۔“

”وہ کار میں بیٹھ گئے اور کار چل پڑی۔“

”لیکن وہ بے حس و حرکت کیوں ہو گئے تھے اور وہ دھماکہ کیسا تھا؟“ حمید نے پوچھا۔

”ایک شعبدہ جو عرصہ سے جیب میں پڑا ہوا تھا۔ اسی موقع پر کبھی نہ کبھی ڈاکٹر ڈریڈی اس کے خاص آدمیوں سے ضرور ملاقات ہوگی۔“

”کیسا شعبدہ....؟“

”تیل ماش والا شعبدہ۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس وقت کرٹل فریدی سے گفتگو کر رہا ہوں یا اگر انہیں احمد قاسم سے۔“

فریدی نے ہلاکا ساقہ قہرہ لگایا اور بولا۔ ”اسی تیل ماش کی وجہ سے تم اپنے بیروں پر کھڑے رہے تھے۔ ورنہ انہیں لوگوں جیسا اختر تمہارا بھی ہوتا۔“

”کیا مطلب....؟“ حمید چونکہ کر بولا۔

”مطلوب پوچھنے کا جون ہو گیا ہے تمہیں۔“

”اس کے علاوہ بھی کئی قسم کے جنونوں کا شکار ہوں۔ لیکن اب آخری جنون باقی رہ گیا ہے۔“

”وہ یہ کہ کسی دن آپ کو شوت کرنے کے بعد اپنے بھی گولی مارلوں۔“

”نہیں تم پہلے خود کو گولی مار لو۔ اگر میں نے ضرورت سمجھی تو اس کے بعد تم سے استدعا کروں گا کہ اب مجھے بھی گولی مار دو۔ ڈیوٹ... یہ تو بتاؤ کہ میں روزانہ تمہارے جسم میں ایک خاص قسم کے تیل کی ماش کیوں کرتا تھا؟“

”اوہ.... اوہ.... اس کے متعلق تو میں نے فرض کر لیا تھا کہ ابھی حال ہی میں زچلی فارغ ہوا ہوں۔“

”وہ اسی ماش کا اثر تھا کہ تمہارے اعضاء اس شعبدے کی حدت نے بیکار نہیں کئے۔“

”میرے خدا....؟“ حمید حیزت سے آنکھیں چھاڑ کر بولا۔ ”آپ نے اتنے دن پہلے سے اس شعبدے کی تیاری کی تھی۔“

”فکر نہ کرو۔ آج کل دو چار شعبدے ہر وقت جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈریڈی سے مقابلہ ہے نا۔“

”مگر یہ شعبدہ کیسا تھا۔“

”جبی گھری کی ساخت کا ایک ناممجم جس میں ایک مخصوص قسم کا مادہ تھا۔“

”یہ آپ کی لیبارٹری کسی نہ کسی دن زوال ضرور لائے گی۔“

”جس دن وہ زوال لائی ہم دونوں بھی افسوس کرنے کے لئے زندہ نہیں ہوں گے۔“

”معاف کیجئے گا۔ اس وقت آپ نے بالکل شاکو عرف بہرام کا یہاں والی حرکت کی ہے۔“

”بعض حقائق انسانی سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔“

کچھ دیر خاموشی رہتی پھر فریدی ہی بولا۔ ”میری سٹھلن والے معاملے پر ہمیں غور کرنا چاہئے تھا۔ مگر خیر چھوڑو ڈاکٹر ڈریڈی کے شعبدوں کا جواب بھی تو ہونا ہی چاہئے تھا۔“

”لیکن آپ نے ان لوگوں کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔“

”اوہ.... پھر ڈاکٹر ڈریڈی تک اس واقعہ کی خبر کون پہنچاتا۔“

”مگر شہری یے.... ذرا یہ تو بتائیے کہ بیگم ارشاد کے نیہاں اور کے کس نے سوئی چھبوٹی تھی۔“

”خود بیگم ارشاد نے۔“ فریدی نے جواب دیا۔ ”اور وہی ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بناء پر میری سٹھلن کے متعلق غور کر سکتے تھے۔“

”کیا آپ بیگم ارشاد سے جواب نہیں طلب کر سکتے؟“

”ضرور کروں گا۔ یہ بھی بہت ضروری ہے اور اسی وقت.... ابھی۔“

”آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”یہ میری خوش قسمتی ہے۔ جس دن میری باتیں تمہاری سمجھ میں آگئیں تم برابری کا دعویٰ کریٹھو گے۔“

”بھم بیگم ارشاد کے بارے میں کیا نہیں جانتے۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ ڈاکٹر ڈریڈی اسے کیوں بلک میل کر رہا ہے؟“

”نہیں....!“

”اچھا میں سمجھا۔“ فریدی نے طنزیہ لجھ میں کہا۔ ”تم یہ جانتے ہو کہ شابینہ اُس کی لاکی ہے جوان ہے حسین ہے اور ابھی تک اُس کی شادی نہیں ہوئی۔ پانچ سو سگریٹ ہتھی ہے اور فخریہ کھنہ ہے کہ پانچ سو چین شوہر ہر وقت اُس کے بیک میں پڑے رہتے ہیں۔“

”لوکی عجیب ہے۔ اس میں شک نہیں۔“ حمید سر ہلاکر بولا۔

”تم گدھے ہو... اب مجھے سوچنے دو۔“

”سوچنے...!“ حمید نے لاپرواٹی سے کہا اور کارکی پشت سے نک گیا۔

”مگر نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے شراب کیوں پی تھی؟“

”اگر آپ پیش کریں تو میں مٹی کا تیل بھی پی سکتا ہوں۔ شراب کیا حقیقت رکھتی ہے۔“

”تم میں ابھی تک اتنا بھی سلقیہ نہیں پیدا ہوا کہ کسی پچوشن کو سمجھ سکو۔“

”میں نے جب بھی کسی پچوشن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میرا ہاضمہ ٹھیک نہیں رہا۔“

”بل اب خاموش رہو۔“

حمدید پھر پشت گاہ سے نکل کر او گھنٹے لگا۔ کچھ دیر بعد ان کی کار ارشاد منزل کے چھانک پر رک گئی لیکن ٹھیک اُسی وقت ایک گھوڑا گاڑی بھی دیہیں آگزرنی۔ فریدی نے اپنی کار بیک کی تاک کو گھوڑا اندر جاسکے گرد فعتاً کوچوان نے گھوڑوں کو دوسرا طرف سڑک پر موڑ دیا۔ ایسی موقعہ پر فریدی سے ستی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ کار سے اڑا اور جھپٹ کر گھوڑے کی راس پکڑ لی۔

”کون ہے؟“ کوچوان کی سیٹ سے ایک خوفزدہ سی آواز آئی اور یہ کسی عورت ہی کی آواز تھی۔ ”اوہ ہو.... نیکم ارشاد....!“ فریدی نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ بڑا اچھا ہوا کہ باہر ہی آپ سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ خواہ خواہ اندر اطلاع بھجوانے کی زحمت کرنی پڑتی۔“

”آپ کون ہیں؟“

”محکمہ سراجِ رسانی کا کرٹل فریدی۔“

”اوہ.... اتنی رات کے.... فرمائیے؟“

”مجھے نہیں معلوم ہا کہ آپ سے اس حال میں ملاقات ہو گی۔“

”آپ مدعا بیان کر جئے۔ آپ کو میرے حالات سے کوئی سر و کار نہ ہونا چاہئے۔“

”ایک صاحب مشر جوزف پیٹر نے آپ کی شکایت کی ہے۔“

”لیکن میں کسی جوزف پیٹر کو نہیں جانتی۔“

”وہ آپ کی صاحبزادی کی سالگردہ کے موقع پر مدعا تھے۔ آپ نے کسی بات پر خفا ہو کر۔“

تعاقب

”جواب دیجئے!“ ہمدردہ ایں آپ ہی سے مخاطب ہوں۔ ”فریدی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”بھجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں۔“ نیکم ارشاد نے مضخل آواز میں کہا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ میں نے مرا کے طور پر ایک آدمی کے کپڑے اتر والے تھے لیکن کیا قانون اُسے جرم قرار دے گا؟“

”نیزاوی نے کا حق صرف عدالت ہائے عالیہ کو پہنچا ہے۔ کسی بھی ملک کے شہروں سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔“

”وہ جوزف پیٹر نہیں بلکہ نیوا اسٹار کا کرامر پورٹ انور تھا۔“

”ہمیں....!“ فریدی کے لجھ میں حرمت تھی۔

”یقین کر جئے۔ وہ خواہ خواہ میری پنجی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ذرا ٹھہریے۔ مجھے یاد کرنے دیجئے۔“ اونہے مجھے نام نہیں یاد آ رہا ہے۔ بہر حال پچھلے دونوں ایک رات آنکھوں میں آپ ہی کے مجھے کے ایک آفیسر کے سامنے اُسے تنیہ کی تھی۔ آفیسر کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ اور میری بڑی شابینہ کو نہیں کی عادت ڈال رہا ہے۔ اس رات بھی خیہہ پولیس کے آفیسر نے اُس کی جیب سے کوئیں برآمد کی تھی۔ پھر ہو سکتا ہے بات رشوت پر ختم ہو گئی ہو۔ بہر حال مجھے اُس سے کوئی غرض نہیں۔ میں نے انور کو تنیہ کی تھی کہ وہ شابینہ سے نہ ملا کرے۔ لیکن اُس کے باوجود بھی ”میں بدل کر کوئی تھی میں آ گھس۔ آپ بتائیے۔ آپ کیا کرتے ایسی کسی موقع پر۔“

”میں اُسے پولیس کے حوالہ کر دیتا۔“

”ہاں مجھ سے غلطی ضرور ہوئی۔“

”مگر بیگم صاحبہ۔“ فریدی نے متیرانہ انداز میں کہا۔ ”میرے پاس ایسے شاہد موجود ہیں جنہوں نے ذر ثیبل پر جوزف پیٹر کے نام کا کارڈ بھی دیکھا تھا۔“

کر تل صاحب! بات صرف اتنی ہی ہے کہ میں نے غصے میں اُس کے کپڑے اتراد لئے تھے اور بس! مجھے اس کا اعتراف ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہوں گی کہ میری جگہ جو بھی ہوتا تھی کرتا۔“
”تو دوسرا واقعہ غلط ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”قطعی غلط ہے جناب۔ آپ خود خیال کیجئے۔ مگر اُس کی ذہانت کی داد دینی پڑنے گی کہ اُس نے کتنی احتیاط سے میرے خلاف یہ پلاٹ گزدھا ہے۔ اُف میرے خدا۔ میری تو عقل بھی وہاں تک نہ پہنچتی۔ اُس خبر میں تھا کہ اُن صاحب کی حالت مختل ہوا گئے سے بہتر ہو گئی تھی لہذا اُس کم جنت نے تین پنکھوں کا اضافہ کر دیا۔ میں پھر کہتی ہوں کہ کپڑے میں نے بلاشبہ اتروائے تھے مگر یہ پلاٹ خدا کی پناہ...!“

”تو یہ غلط ہے؟“

”قطعی غلط ہے؟“

”شکریہ! محترمہ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی۔“ فریدی نے کہا اور گھوڑے کی راس چھوڑ کر گاڑی کے پاس سے ہٹ آیا۔ پھر کار میں بیٹھتے ہوئے اُس کی تاریخ کی روشنی گاڑی پر پڑی۔

بیگم ارشاد سر سے پیر تک سیاہ البادے میں لپٹی ہوئی کوچوان کی سیٹ پر موجود تھی۔ تاریخ بجا دی گئی۔ پھر فریدی نے انہیں اشارت کر کے کار بیک کی اور پکھہ دیر کے بعد حمید نے کہا۔ وقت کی اس بربادی کا کیا مقصد تھا؟“

”بیوی گھاگ گورت ہے۔“

”ہے تو۔“

”لیکن آج ہم نے بھی اُسے اس حال میں دیکھ لیا۔ آخر وہ اس طرح کیا کرتی پھرتی ہے۔“

”اس پر قانون کوئی پابندی نہیں عائد کر سکتا۔“

”شاہزادہ اُس کے لئے بہت پریشان معلوم ہوتی ہے۔“

فریدی پکھہ نہ بولا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ دفتار حمید بنے کہا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
”وہیں جہاں سے یہ سفر شروع ہوا تھا۔ اب وہ اس قابل ہوئے ہوں گے کہ اپنی جگہ سے جبڑ کر سکتیں۔“

”تو آپ انہیں چھوڑتی ہی کیوں آئے تھے؟“

”اتھی دیر میں ایک دوسرا کام بھی ہو گیا۔“

حمد نے بے بی سے ایک مختل ہی سانس لی اور سیٹ کی پشت سے نکل گیا۔

”وہ گواہ آپ کو اور ہی کے توسط سے ملے ہوں گے۔“ بیگم ارشاد نے لاپرواں سے جواب دیا۔
”قدرتی بات ہے۔ گواہ ہمیشہ بدعتی کی طرف سے پیش ہوتے ہیں۔“
”کچھ بھی ہو۔ وہ گواہ جبوٹی ہیں۔“
”اسے قعدالت ہی میں چیلنج کیجئے گا۔“

”عدالت...!“ بیگم ارشاد کی آواز پھر کانپ گئی اور پکھہ دیر کیلئے پھر سکوت طاری ہو گیا۔
”جی ہاں عدالت۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”وہ آپ پر ازالہ میثیت عرفی کا دعویٰ کرنے جا رہا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ آپ کی بیٹی نے اُسے اپنی سالگرہ کی تقریب میں شرکت پر مجبور کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا.... آوضرو خواہ بھیں ہی بدل کر آتا پڑے۔“

”یہ سراسر بہتان ہے۔“

”یہ بھی آپ عدالت ہی میں ثابت کیجئے گا۔“

”پھر آپ کس لئے تعریف لائے ہیں؟“ بیگم ارشاد کا لیجر بہت تیز تھا۔

”میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ایک دوسرا معاملہ بھی ہے۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوا گا کہ میرے اسٹنٹ کیپشن حمید کو منے پول میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ اُس نے اپنے بازو میں سوئی کی چبجن محسوس کی اور پکھہ دیر کے لئے اُس کا جسم بالکل بیکار ہو گیا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے یہ خبر دیکھی تھی۔“

”ویسا ہی واقعہ آپ کی کوئی میں انور کو بھی پیش آیا تھا۔ اُس نے اپنے بازو میں سوئی کی چبجن محسوس کی اور پکھہ دیر کے لئے اُس کا جسم بالکل بیکار ہو گیا۔“

”میرے خدا۔ وہ ہر زاویے سے ایک نئی چال چال چل رہا ہے۔“ بیگم ارشاد بڑی بڑی۔

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی صورت سے مجھے زک پہنچائے۔ ہاں اُس نے اور کیا کہا تھا؟“
”اُس نے کہا تھا کہ جب اُس کا جسم بے حرکت ہو گیا تو آپ اُسے ایک کمرے میں اٹھوا لے گئیں۔ وہاں آپ کے ملاズ مول نے اُس کے کپڑے انہار کر تین پکھے کھول دیئے اور پھر ہوا کے اس طوفان میں اُس کی کھوئی ہوئی تو تین آہستہ آہستہ واپس آئے لگیں۔ اُس کے بعد“
بالکل ٹیک ہو گیا۔“

”اُف فوہ۔“ بیگم ارشاد نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”کس کس طرح بات بنائی ہے۔ اُس سورنے۔ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے قاؤنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ یقین کیجئے

دوسروں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر ایک کری پر بیٹھ کر انہیں تشویش کن نظر وہ دیکھنے کا
”بیچھے میں نہیں آتا کہ وہ دونوں کیسے اپنے پیاروں پر جل کر گئے ہوں گے۔“ اس سراخا کر
پڑھ لیا۔

اُس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس مسئلے پر
کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اُس کی پیشانی پر ٹکنیں تھیں اور آنکھوں سے کینہ توڑی جھلک رہی
تھیں۔ ہوتھوں کے گوشے تھفر آمیز انداز میں کچھ کر نیچے جمک گئے تھے اور اپری ہونٹ نے قوس
کی شکل اختیار کر لی تھی۔

کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ ”یہ کھلی مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اس کا قاتل ہوں کہ جب
بھی دشمن سامنے آئے اس نے آگ کی زبان سے گھنگو کرنی چاہئے۔“

”مگر ہم کیا کریں۔“ دوسرا بولا۔ ”جو کچھ کہا گیا تھا اُسی کے مطابق عمل کر رہے تھے۔ مگر وہ
چوتھے دے گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُسکی بھی گھری کوئی ایسا وقت بھی ہم پر لائے گی۔“
”اتفاق....!“ وہ آدمی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”خراب اس قسم کے دفن کرو۔ سوال یہ ہے کہ اب
ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“

”کیوں....؟“

”یہ بہت معمولی سی بات ہے۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ وہ حیثیتاً ہمیں اتنی لاپرواں سے چھوڑ کر
چلا گیا ہوگا۔“

”یقیناً اب اُس کے آدمی نیچے موجود ہوں گے۔“ دوسرا بولا۔

”پھر اسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”ان روپ اور وہن کو باہر پھینک دو۔ وہ ہمارے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ کر سکے گا۔ ہم
پاسپورٹ پر پیہاں آئے ہیں اور ہمارے ٹک کا سفارت خانہ ہمارا ذمہ دار ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر یہاں تو کوئی قابل گرفت چیز موجود نہیں ہے۔“

”کچھ بھی نہیں۔“

”تب تو انہوں ہم بے خطر چلیں گے۔“

”لیکن ٹھہر و گو کہ یہ عمارت میرے ہاتم سے حاصل کی گئی تھی لیکن شاید یہ یہاں کسی نے
آن تک میری ٹھکل دیکھی ہو۔ میری سٹھکلشن یہاں آتی رہی ہے۔“

”اُس کی فکر نہ کرو۔ میری بھی سفید قام ہی ہے۔“

چاروں کی حالت ابتر تھی۔ کچھ دیر وہ کھڑے رہے پھر بے جان ہو کر فرش پر گر گئے۔ ان کی
زبان میں نکلی پڑھی تھیں اور وہ چوپا یوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ان میں سے ایک بدقت تمام گھستہ ہوا دروازے تک پہنچ سکا۔ اُس کا ایک ہاتھ
ہینڈل کی طرف اٹھا اور تھوڑی دیر تک اٹھا ہی رہ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہاتھ میں توازن کی
کس عین نرہ گئی ہو۔ وہ خلا میں جھوٹا رہا۔ کی بارہ وہ ہینڈل سے بھی ٹکرایا لیکن اُسے گرفت میں نہ
لے سکا۔

ادھا گھشتہ گذر گیا۔ کمرے کی فضائیں اچانک بیدا ہو جانے والی حدت ختم ہو گئی تھی اور ان
کے سیم برہنہ جسموں پر سردی کی لمبیں اثر انداز ہونے لگی تھیں لیکن وہاب بھی اس قابل نہیں
تھے کہ اٹھ کر کپڑے پہن سکتے۔

”اب اٹھنے کی کوشش کرو۔“ ان میں سے ایک بولا۔

”مشکل... نہیں... نہیں... اٹھو... ڈھو...!“ دوسرا نے کچھ کہتا چاہا لیکن زبان اٹھنے لگی۔
اور پھر وہی پہلے کا ساسکوت طاری ہو گیا۔ دروازے کے قریب پڑا ہوا آدمی شاید بیقیہ تھا
آدمیوں سے زیادہ طاقت ور تھا کیونکہ وہ دروازے کا ہینڈل پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ اٹھ گیا اور تھوڑی دیر تک دیوار سے ہاتھ لیکے کھڑا رہا۔ پھر اس طرح دوسروں کی طرف
مڑا ہیتے وہ انہیں بھی اسی حالت میں دیکھا چاہتا ہو۔

پھر وہ دیوار پر ہاتھ رکھے ہی رکے اور بڑھنے لگا جہاں ان کے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔
وہ کپڑے پہن لینے میں کامیاب ہو گیا اور دوسرا نے اسے اس انداز میں دیکھتے رہے جیسے رام
کی بھیک مانگ رہے ہوں۔

”ہمیں بھی سردی الگ رہی ہے۔“ ایک نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”ٹھہر و...!“ وہ آدمی بولا۔ ”میں تم سب کو کپڑے پہنناوں گا۔“

اور اس کام میں تقریباً میں منٹ سرف ہوئے۔ وہ پھرتی سے اس کام کو انجام دینے کے
قابل اب بھی نہیں ہو سکتا۔

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ کپڑے پہن لینے کے بعد سے تو انہی وابس آرہی ہے۔“ اس نے

آدمیوں کے ساتھ۔“
حقیقت کھڑکی پر چار سائے نظر آرہے تھے۔ تکٹے پر رکھا ہوا گلدن بھی سر اور شانوں کا سا
سایہ پیش کر رہا تھا۔

”اب میں.... دوسری طرف سے نیچے اتر جاؤں گا۔“ زمین پر لیٹھے ہوئے آدمی نے آہستہ
سے کہا اور ریگلتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔



”ارے صح ہونے والی ہے جاپ! کیا آپ اوگھے رہے ہیں؟“ حمید بھراں ہوئی آواز میں
بڑا بڑا لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں فریدی کا ہاتھ حمید کے بازو پر پڑا اور وہ اُسے دباتا ہوا بولा۔ ”واہ
بھی ذرا دیکھنا تو۔“

وہ اُس بڑی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا جنکے دھنڈے شیشوں پر پچھائیاں نظر آرہی تھیں۔

”تو وہ نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔“ حمید بڑا بڑا لیا۔

”اوہ.... حمید.... ذرا دیکھنا۔ کیا بائیں گوشے والی پر چھائیں.... کسی ڈمی کی نہیں ہے۔“ تین
پر چھائیاں کبھی کبھی متحرک ہی نظر آتی ہیں۔ مگر جو ختمی.... اُو۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا بولा۔ ”اس شعبدے نے ان کی عقولوں پر پھر ڈال دیتے ہیں۔
یہ نرود ہیں حمید.... اور اسی لئے ان سے یہ حماقت سرزد ہوئی ہے۔“ عمارت میں فون نہیں ہے
لہذا وہ یہیں بیٹھے ڈریڈ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ دے سکیں گے۔“

وہ عمارت کی پشت پر آگئے۔

”آہ....!“ فریدی نے پھر اُس کا بازو دبایا۔ ”میرا خیال غلط نہیں تھا۔ وہ دیکھو۔“

تیری منزل کی کھڑکی سے ایک سیاہ و حصہ سا باہر رینگ آیا تھا اور اب وہ فیصل پر چلتا ہوا
پاپ کی طرف پڑھ رہا تھا۔

”آپ اگر سڑک کنارے پیٹھے کر لو گوں کو اُن کی قسمت کا حال بتانے لگیں جب بھی آپ
استئن عمالدار رہیں گے۔“

وہ اُسے پاپ کے سہارے نیچے اترتے دیکھتے رہے۔ نیچے چینچتے ہی وہ دم لئے بغیر بڑی تیزی
سے سڑک کی طرف ٹریکیا۔ وہ دونوں بھی بالکل اسی انداز میں آگے بڑھے جیسے شب گزار آوارہ
گرو ہوں۔ اُن کے قلک ہیبت پیشانیوں پر بھکے ہوئے تھے اور الشروں کے کارکنوں کے انٹے

”اگر ہم یہیں ٹھہریں تو کیا مضاائقہ ہے۔“

”تم گھاس کھا گئے ہو شاید۔ ہمیں ہر حال میں اس واقعہ کی خبر اسی وقت پہنچانی ہے۔ ورنہ
ذاکر کچاہی چجا جائے گا۔“

ان الفاظ کے سنتے ہی پھر کسی نے کوئی نئی تجویز نہیں پیش کی۔ لیکن یہ سوال اب اُن کے
ذہنوں کو ٹھوکے دے رہا تھا کہ یہ اطلاع پہنچائی کس طرح جائے گی۔

”مجھے یقین ہے۔“ تو انہی آدمی بولا۔ ”کہ اس وقت تک عمارت کا حصارہ ہو چکا ہوا اور یہ بھی
بجھ رکھو کہ فریدی ہمارے فقرے میں نہیں آیا۔ وہ ہم میں سے کسی کو بھی ذاکر سمجھنے پر تیار
نہیں۔ لہذا اس طرح چپ چاپ چلے جانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارا تعاقب کر کے ذاکر
تک پہنچنے کا رادہ رکھتا ہے۔“

ایک بار پھر کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔

دفعہ ایک آدمی نے انٹھ کر کہا۔ ”میں اطلاع پہنچاؤ گا۔“ تم تینوں یہیں ٹھہر دے گے۔

”کس طرح؟“

”بیں آؤ میرے سنا تھا۔“

وہ چاروں اُس کرے میں آئے جس کا رخ سڑک کی جانب قائم ہوا۔ ایک بہت بڑی بڑی
تمحی جس میں دھنڈے شیشے لگے ہوئے تھے۔ وہ آدمی جس نے کوئی راہ نکالنے کا خیال ظاہر کیا تھا
اندر ہیرے ہی میں کریاں کھکانے لگا۔

”خبردار... سونچ آن مت کرنا۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔

کوئی کچھ نہ بولا۔ کچھ دیر بعد اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”ایک آدمی یہاں آئے۔ ادھر یہ
میرا ہاتھ اُسے پکڑلو۔“

تین ہاتھ بیک وقت اُس کے ہاتھ سے مس ہوئے۔ لیکن اُس نے صرف ایک کو اپنے
قربیں کھینچ لیا اور بولا۔ ”یہاں بیٹھ جاؤ۔“

ایسی طرح اُس نے تینوں آدمیوں کو یہکے بعد بیگرے کر سیوں پر بخادیا
اور پھر جب کرے میں روشنی ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ آدمی زمین پر چٹ پڑا ہوا ہے
چو تھی کرسی پر ایک تکیر کھا ہوا تھا اور تکٹے پر ایک بینوی شکل کا گلدن الٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔
”یہ کیا پا گل پن ہے۔“ ایک نے جرت سے پوچھا۔

زمیں پر پڑے ہوئے آدمی نے بڑی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”چار بیٹھے ہو۔“

ہوئے تھے۔

”آہا... پیدل نہیں جائے گا حمید صاحب.... جلدی کرو۔ وہاں اُس گلی میں میں نے ایک کار پہلے بھی دیکھی تھی۔ غالباً یہ لوگ اسی پر آئے تھے۔“

حمدودور تاہو اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ اتنی دیر میں وہ کار اسٹاٹ ہو کر جمل بھی پڑی تھی اور فریدی کھڑا بے بس سے اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ حمید نے اسے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی کہ وہ وقت ہی پر کار وہاں لے آئے گا۔ لیکن اس وقت اسے بھی مان لینا پڑا کہ حمید بالکل ہی ناکارہ نہیں ہے۔ اگلی کار گلی کے آخری سرے پر مزید ہر ہی تھی کہ اُس کی لگن اُس کے قریب پہنچ گئی۔

”سید ہے چلو...!“ فریدی دو اونہ کھول کر حمید کے برابر بیٹھتا ہوا بولا۔

اور پھر کچھ دیر بعد وہ اگلی کار کے راستے پر لگ گئے۔

”میں کیا کروں۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا۔“ حمید بڑا رہا تھا۔

”کیا کچھ میں نہیں آتا۔“

”یہ رات تو یو نہیں گئی۔ کیا میں دن کو سو سکوں گا؟“

”قلعی سو سکو گے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”مگر کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ ڈاکٹر ڈریڈ ہی کے آدنی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فتح کے آدمیوں نے ڈاکٹر ڈریڈ کے لئے کوئی نتیجہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔“

”فتح نہیں... ہرگز نہیں۔ فتح ہمیشہ قانون سے کتراتا رہتا ہے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ کی طرح حق نہیں ہے۔“

”آپ ڈاکٹر ڈریڈ کو حق کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں وہ بلاشبہ الحق ہے۔ وہ مجرم جو قانون پر اپنی برتری جتنا کی کوشش کرتے ہیں میں انہیں حق سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ان کا اظہار برتری ہی ان کے لئے چنانی کا پہنچہ بن جاتا ہے۔ فتح یے لوگ عموماً محفوظ ہی رہتے ہیں۔“

”آخر یہ لوگ قانون پر اپنی برتری جتنا کی کوشش ہی کیون کرتے ہیں؟“

”فطرت... اتیازی خصوصیات کے حال ہونے کا شوق۔ جس طرح عام آدمی کسی خاص معاملے میں شہرت حاصل کرنے کے موقع ہوتے ہیں اسی طرح بعض مجرم بھی عام روشن سے ہٹ کر اپنی کوئی اتیازی خصوصیات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ عام مجرموں میں تو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ قانون کے مخالفوں کو چیخ کر سکیں لیکن بعض مجرم ایسا بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈریڈ دوسرا

یہ قسم کے مجرموں میں سے ہے اور اسکی یہ عادت ہی ایک دن اُسکے انجمام کا ذریعہ بن جائے گی۔“

”مگر یہ آج تک نہ معلوم ہوا کہ فتح سے اُس کا جھگڑا کیوں چل رہا ہے۔“

”یہ تو اسی وقت معلوم ہو سکے گا جب ان دونوں میں سے کوئی ہاتھ آجائے۔“ فریدی نے کہا اور پھر وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ دونوں کاریں آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔

تحوڑی ہی دیر بعد اگلی کار شہر کی اُس بیٹی میں داخل ہوئی جہاں غیر ملکی سفیروں کی کوٹھیاں تھیں۔ اور پھر وہ ایک عمارت کے سامنے رک گئی اور وہ آدمی اُتر کر کپاٹن کا چالک کھولنے لگا۔ فریدی کی کار آگے نکلی چلی گئی۔

”لیا مطلب....؟“ حمید اس وقت بڑا یا جب فریدی کی کار پھر اسی راستے پر ہٹنے لگی جس سے وہ پہاں تک آئے تھے۔

”کچھ نہیں اب گھر چل کر سوئں گے۔“

”میں اسٹرینگ چھوڑ کر باہر چلا گک اگدؤں گا۔“ حمید جلا کر بولا۔

”بگرو غمیں فرزند! کیا تم یہ چاہتے تھے کہ ہم بھی اُس کے ساتھ ہی عادت میں گھس پڑیں گے۔ یہ ایک غیر ملکی سفیر کی کوٹھی ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ یورپی مخالفوں سے گرفت میں آئے گا۔“

حمدید نہ اسامنہ بنا کر بولا۔ ”بھی وہ آپ کی جیب میں رکھا رہتا ہے اور کبھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ کبھی آپ فتح کے لئے روتے پچھلماڑتے ہیں میری جوانی مفت میں برباد ہو رہی ہے۔“

فریدی ایک ہلاکا ساقہ تھہ لکا کر خاموش ہو گیا۔ اس کا مطلب جو کچھ بھی رہا ہو۔

نکھا شیطان

اُس آدمی نے کپاٹن طے کیا اور برآمدے میں پہنچ گیا لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ اُس کا تعاقب ہوتا رہا ہے۔ وہ کچھ اتنا ہی بد حواس تھا کہ جب فریدی کی کار اُس کے قریب سے آگے نکلی تو اُس نے اُس کی طرف دھیان لکھ نہیں دیا تھا۔ پھر اُسے اُس بے آواز موڑ سائیکل کا علم کیسے ہوتا جو فریدی کی کار نکل جانے کے بعد تھیک اُسی کی کار کے قریب رکی تھی۔

وہ بے تحاشہ عمارت کے اندر داخل ہوا اور اپہاری میں رک کر اُس بٹن کو بار بار دبانے کا جس کے اوپر ایک نحاس سرخ رنگ کا بلب روشن تھا۔

”پھر اب کیا ہو گا؟“

”مجھے بھی مشورہ دو کہ یہاں سے اب نکل جاؤ۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ ڈاکٹر نے پھر کہا۔ ”تم لوگ اپنی عقلیں درست کرو ورنہ مجھے ہی درست کرنی پڑیں گی۔“

”ایک بار اور معاف کیجئے جاتا۔“ وہ گزگز لیا۔ ”دراصل اس گری کا اڑاب بھی میرے ذہن و جسم پر باقی ہے۔“

”میں نہ جانے کیوں اتار حمل ہو گیا ہوں۔“ ڈاکٹر نے نہ اسامنہ بنا کر کہا۔
ٹھیک اُسی وقت ایک کھڑکی کے پاٹ دیواروں سے ٹکرائے اور ایک نخاسا آدمی اندر کو دیا۔ اس کے دامنے ہاتھ میں ریو اور تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سیاہ تھا اور ہونٹ سرخ۔ جسم پر سیاہ لباس تھا اور سینے پر سفید حروف میں تحریر تھا۔ ”شیطان ۱۱۲۔“

”واقعی یہ بہت بُرا ہے۔“ وہ گلگتالی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کہ تم اتنے رحم دل ہو گئے ہو لیکن مجھے دیکھ کر بے رحم ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ آج بہت دنوں کے بعد میں تمہیں اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ لہذا اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“

ڈاکٹر کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور دوسراے آدمی نے بھی اُس کی تقیید کی۔

”تمہارے آدمی بچ ج بالکل گدھے ہو گئے ہیں۔ فریدی نے تمہاری رہائش کی جگہ دیکھی ہویا نہ دیکھی ہو میں نے آج دیکھ لی۔“

”جاوہ... میرا وقت نہ بریاد کرو۔“ ڈاکٹر ڈریٹھ نے کچھ اپنے انداز میں کہا جیسے کسی متر آدمی نے کی پچھے کو مشورہ دیا ہو۔ اور اُس نے اپنے ہاتھ بھی پچھے گرا دیئے۔

”یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے ڈاکٹر ڈریٹھ... اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔“ نفخ شیطان نے کہا۔
ڈاکٹر ڈریٹھ نے پھر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

”میں سر کس کا ایک مخزہ۔ آج تمہیں اس طرح قتل کروں گا کہ ساری دنیا اٹشت بدندال رہ جائے گی۔“

”بکواس بند کرو۔“ ڈاکٹر ڈریٹھ فرش پر اپناداہنا پر ٹھیک کر گرا اور ایک روشن دان سے کچھ نیکوں سی روشنی پھوٹئے گئی لیکن وہ روشنی صرف چھٹت تک محدود رہی اور کسی نے بھی اُس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

سامنے والا دروازہ فورائی کھلا اور ایک آدمی نے اسے اندر آنے کا اشتادہ کیا۔ یہ آدمی شاید جانتا تھا کہ اُسے کہاں جاتا ہے کیونکہ وہ کسی راہبر کی مدد کے بغیر ہی مختلف ستون میں مژتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد وہ اپری منزل کے زینے طے کرتا ہوا نظر آیا۔

یہ ایک بڑا کمرہ تھا جہاں رک کر وہ چاروں طرف مجسماں نظر دیں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کرے میں نہ تو کسی قسم کا فرنچیز ہی نظر آرہا تھا اور نہ اس کی دیواریں ہی سجائی گئی تھیں۔ فرش پر البتہ ایک دیزیں ساقیلین پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد بائیس جانب کا ایک دروازہ کھلا اور ایک دراز قد آدمی اندر داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ سنا ہوا تھا اور ہونٹ پتلے تھے۔ آنکھیں بہت چمکیلی تھیں۔

”تم نے ریٹہ سکلن کیوں دیا تھا؟“ اس نے نہ سکون لجھے میں پوچھا۔

”آس آدمی نے ہانپتے ہوئے پوری داستان دہرا دی اور پھر بولا۔“ ڈاکٹر... اگر میں یہ تدبیر نہ کرتا تو یہاں تک پہنچا جائیں ہو جاتا۔“

”تدبیر...!“ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک تلخی مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”کیا تم مجھے یہ اطلاع کسی پیلک ٹلی فون بو تھے سے نہیں دے سکتے تھے یہاں دوڑے آئے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نے.... سوچا.... سوچا...!“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن سوچتا ہی رہ گیا۔
”بکو... کیا بک رہے تھے۔ کیا فریدی ابھی تک اتنا ہی احمد ثابت ہوا ہے کہ تم اس کے ساتھ اس قسم کی کوئی چال چل سکو۔“

”وہ آدمی کچھ نہ بولا۔ ڈاکٹر کہتا رہ۔“ ڈاکٹر تم صح تک دیں ٹھہر تے تو کیا حرج تھا؟“

”مم.... میں نے سوچا۔“

”کچھ نہیں سوچا۔ تم میں سوچنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اسی بناء پر تمہیں حرast میں لے سکتا تھا کہ تمہارے پاس ریو اور تھے۔“

”اگر مجھ سے غلطی ہوئی تو میں شرمندہ ہوں جاتا۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ اگر تم لوگوں کو اپنی غلطیوں پر شرمندگی ہو تو انہیں بھی نہ دہراو۔“
وہ کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے کھڑا رہا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”وہ تمہیں اسی لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا کہ تمہارے ذریعہ مجھ تک پہنچ سکے۔“

”اوہ....!“ وہ مجتوہ نہ انداز میں اپنی پیشانی رکھنے لگا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہو گا۔“

طرف الٹ گیا۔ پھر خود ڈاکٹر ڈریٹ نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن منہ کے مل زمین پر گر پڑا اور نخما شیطان دور کھڑا ایک برا سا چاقو کھول رہا تھا۔ ڈریٹ نے پھر اپنے آدمی کو لکارا۔ لیکن اس پر اس نے اس پر جھپٹی کی ہمت نہیں کی بلکہ اس کے چاقو پر نظر جائے ہوئے بہت احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ نخٹے آدمی کی چھوٹی چھوٹے آنکھیں کسی ایسے سانپ کی آنکھوں سے مشابہ نظر آرئی تھیں جو کسی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو۔

اور پھر قبل اس کے ڈریڈ کا آدمی اس تک پہنچا اس نے خود ہی اس پر چھلانگ لگائی۔ ایک طویل جیج کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ ٹھیک اسی وقت کسی نے دروازہ پیشناشد روک دیا۔ نخٹے شیطان نے کھڑکی کی طرف جست لگائی مگر ڈاکٹر ڈریٹ بھی حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اس کے قریب پہنچ گیا۔ نخٹا شیطان پھر پلانا لیکن اس بار چاقو کی نوک دیوار سے مکرائی۔ ڈاکٹر ڈریٹ بال بال بچا تھا۔ دروازہ بدستور پیٹا جاتا رہا۔

جتنی دیر میں ڈاکٹر ڈریٹ سمجھلا، نخٹا شیطان غائب ہو چکا تھا۔ ڈریڈ کھڑکی پر جھکا اور باہر پھیلے ہوئے اندر ہیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔

تقریباً دو منٹ تک وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ دروازہ پیٹنے کی آوازیں اب بھی اس کے کافوں سے مکرار ہی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پرواہ ہی نہ ہو۔ پھر اس نے مژ کر ایک اچھی ہوئی سی نظر اس آدمی پر ڈالی جس کے سینے سے خون بہہ بہہ کر قائم میں جذب ہوتا جا رہا تھا اور یہ دیکھے بغیر کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا اس دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جسے دوسری طرف سے پیٹا جا رہا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف سے ایک زرد پوش آدمی اس پر آگرا۔

”اوہ....!“ وہ اسے چھپوڑ کر الگ ہٹاتا ہوا بولا۔ ”تم دروازہ کیوں پیٹ رہے تھے؟“ زرولبادے والا چند لمحے کھڑا پلکیں جھپکا تارہ پھر بولا۔ ”میں فرشتہ ہوں۔ مجھ سے اوچی آواز میں گنگونہ کیا کرو۔ میں اپنے ساتھی فرشتہ کی تلاش میں ہوں۔ جو کچھ دیر پہلے میرے ساتھ تھا۔ کیا تم میری مدد کر سکو گے؟“

”جاوہ سو جاؤ۔“ ڈاکٹر ڈریٹ ہاتھ بہا کر بولا۔ ”تم ہمیشہ سوتے سوتے بناگ کر بکواس کرنے لگتے ہو۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہو گا۔“

”تم خود بکواس کر رہے ہو۔ اس کے ساتھ موت کا فرشتہ بھی تھا اور ہم تینوں نے ایک ہی ممزور شراب پی تھی۔“

نخٹا شیطان کہہ رہا تھا۔ ”بیکار ہے ڈاکٹر! تم مجھ سے اتنی زیادہ بلندی پر واقع ہوئے ہو کہ مجھ تک تمہاری یہ گرج تقریباً ایک ہزار دو سو سو سو سال میں پہنچے گی لیکن اس تیم لڑکی کی جیھیں ہر وقت میرے کافوں میں گو جنتی رہتی ہیں جو صرف تیرہ سال کی تھی۔ تیرہ سال کی نصفی ہی جان... جسے تم نے بڑی ہی بے دردی سے اپنی ہوس کی بھیت چڑھایا تھا اور جس کی لاش دوسری صبح سڑک پر پڑی اوچی اور جی ہمارے توں پر طڑک رہی تھی۔“

ڈاکٹر ڈریٹ نے اپنے ہاتھ نیچے گرادریے اور بڑی لاپرواٹی سے اپنے آدمی سے بولا۔ ”میں پچھلی رات بھی دیر یک جاگتا رہا ہوں اور اب اس وقت تم نے میری نیند میں خلل ڈالا ہے۔ مجھے تم پر بہت غصہ آ رہا ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ اس کا ذرا ہو جائے گا ڈاکٹر۔“ نخٹا شیطان چیک کر بولا۔ ”میں تمہیں الکی نیند سلاوں گا کہ یہ گدھے پھر تمہیں نہ جگا سکیں گے۔ تمہارے کارنائے جہت سے جاتے ہیں۔

لہذا تمہاری موت بھی دوسروں کے لئے جہت انگیز ہوئی چاہئے۔ انہائی جہت انگیز۔ سر کس کے ایک نخٹے سے سخزے نے ڈاکٹر ڈریٹ کو مار ڈالا۔۔۔ ہاہا۔۔۔ سر کس کا بے ضرر سخزہ۔۔۔“

پھر وہ دانت پیس کر بولا۔ ”میں ایک اچھا آدمی تھا مخت سے روزی کاماتا تھا لیکن۔۔۔ اس نصفی ہی پچھی کی چیزوں نے مجھے ہیسے حقیر آدمی کو ڈاکٹر ڈریٹ سے مکرا دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میں کیا نہیں کر سکتا۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ میں سر کس میں بھکاریوں کی طرح کیوں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوں۔ حرام خوروں کے لئے تفریح کیوں بنوں جب کہ میں ان کی جمع کی ہوئی دولت پر پہ آسانی ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔ ہاہا۔۔۔ ڈاکٹر ڈریٹ۔۔۔ اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

دفعہ نخٹے شیطان کے ریوالو سے ایک شعلہ نکلا لیکن خود اس کا پورا جسم کا پ گیا۔ کیونکہ چھت میں نظر آنے والی روشنی آسمانی بجلی کی طرح پورے کرے میں کونڈتی ہوئی سی معلوم ہوئی تھی۔۔۔ حقیقتاً نخٹا شیطان چند ہیا گیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں نشانہ کیوں نہ خطا کرتا۔ دیے نخٹا شیطان اچھل کر فائز کرتا رہا۔ ہر فائز پر دشمنی کا جھمکا ضرور ہوتا اور اس دوران میں ڈاکٹر ڈریٹ کے قیقهے بھی برابر گوئیتے رہے۔

جب ریوالو کے سارے راؤٹ ختم ہو گئے تو ڈاکٹر ڈریٹ نے گرج کر کہا۔ ”پکڑواں خبیث کو۔“ دوسری آدمی جو ابھی تک سہا ہوا کھڑا تھا نخٹے شیطان پر چھپت پڑا۔ لیکن وہ اسے اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔ کیونکہ نخٹے شیطان کے دوقوں پر اس کے منہ پر پڑے تھے۔ وہ کراہ کر دوسری

گئی اور اس نے اسے چائے پر بلالی۔ ظاہر ہے ایسے موقع پر "عوامیت" کی ہوا تک جاتا لازمی تھی۔ لہذا وہ حمید کے پاس پہنچا اور اپنے کپڑے وہیں اٹا کر حمید کا سوٹ پہن کر جو غائب ہوا تو آج پانچ ہیں سال حمید کو اس کی شیر وانی یاد آئی۔

شیر وانی پہن کر اس نے پھر آئینے پر نظر ڈالی اور آپے سے باہر ہو گیا۔ صندوق پوری طرح الٹ پلٹ ہو گیا تھا اور ایک سرخ رنگ کی پھندنے دار ٹرکش کیپ اور ہی پڑی نظر آرہی تھی۔ حمید نے اسے اٹھا کر سر پر منڈھ لیا اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آئینے ہی کو چھوڑ دالے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اب وہ کمرے میں رکنا ہی نہیں چاہتا تھا لہذا باہر نکل آیا لیکن جب نوکروں کو منہ پھیر پھیر کر ہنسنے دیکھا تو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ "کیوں ہستے ہو الو کے پھو۔"

لیکن وہ کوئی جواب دیئے بغیر ادھر ادھر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد وہ موڑ سائیکل پر اُسی مقام کے لئے روانہ ہو گیا۔ جہاں فریدی نے طلب کیا تھا۔ پاجائے کے پائیچے پھر پھر اڑا رہے تھے اور ٹرکش کیپ کا پھندن اپٹ پر لمب اتنا چلا جا رہا تھا۔

فریدی اسے اسی عمارت کی کپاؤٹ میں نظر آیا جہاں پچھلی رات انہوں نے ڈاکٹر ذریثہ کے آدمی کو داخل ہوتے دیکھا تھا لیکن فریدی تھا نہیں تھا۔ کپاؤٹ میں کسی باور دی آدمی بھی موجود تھے۔ حمید اپنی بیت پر بُری طرح جھینپا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید فریدی تھا ہو گا لیکن وہاں پولیس کا آئی ہی موجود تھا۔ ان سب نے حمید کو حیرت سے دیکھا جو اسے قریب سے جانے تھے منہ پھیر کر مکرانے لگے۔

مگر فریدی نے اس پر نہ تحریر کا ظہار کیا اور نہ غصے کا بلکہ اس انداز میں حمید سے گفتگو کرنے کا بھیے حمید ہمیشہ سے اسی قسم کا لباس استعمال کرتا آیا ہو اور اس کی نظرؤں میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ وہ اس سے کسی لاش کے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور حمید کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسی حرکت پر فریدی بہت سختی سے جواب طلب کرے گا۔

لیکن کچھ دیر بعد جب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے عمارت میں لے جا رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ انہیں چاروں آدمیوں میں سے ایک کی لاش ہے۔"

"اوہ..... تو اسے ڈاکٹر ذریثہ ہی نے ختم کیا ہو گا۔" حمید بولا۔

"ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس جگہ نہیں قتل کیا گیا جہاں اس وقت اس کی لاش پہنچی ہوئی ہے۔"

"تم جاتے ہو یا میں اپنا ہنڑ ملکواؤں؟" "میں جا رہا ہوں۔" زرد پوش فرشتہ دنوں ہاتھ ہلا کر بولا۔ "لیکن تمہیں بدعا ضرور دوں گا۔ تمہاری کشی ضرور ڈوبے گی۔ اسے لکھ لو۔ طوفان توح پھر آئے گا تم سب غرق ہو جاؤ گے۔" "جاو۔" ذریثہ نے اسے دھکا دے کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

کلاک نے دن کے دس بجاءے اور کمپنی حمید نے اس طرح منہ بنا کر کروٹ لی جیسے کوئی اس کی مرضی کے خلاف اسے جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

تقریباً پانچ بجے واور فریدی گھر پہنچے تھے اور حمید کپڑوں جو توں سمیت ہی بستر میں جا گھساتھا۔ گھنٹے کی آواز سے اس کی نیند اچٹ گئی اور پھر وہ کوشش کئے باوجود بھی نہ سو سکا۔ آخر سے اٹھ ہی جاتا پڑا۔ اور وہ نکل کرتے ہوئے کلاک کو گونسہ دکھا کر بولا۔ "میں تیرے موجود پر بھی لخت بھیجا ہوں۔"

اور پھر اس طرح مطمئن نظر آنے لگا جیسے کچھ کلاک نے اس کی بات سے برا اثر لیا ہو۔ باتح رومن کی طرف جاتے وقت فریدی سے ملاقات ہو گئی جو اندر وہی پر آمدے میں بیٹھا خبردار دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ اخبار دیکھنے کا وقت نہ تھا اور فریدی کا دھماں اس وقت موجود ہونا بھی خلافِ معمول تھا کیونکہ وہ ٹھیک نونج کر پینٹا لیس منٹ پر دفتر چلا جایا کرتا تھا۔

"ہا میں اتم جاگ کیوں پڑے۔" فریدی نے اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک خواب انک گیا تھا۔" حمید نے لاپرواپی سے کہا اور عسل خانے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب واپس آیا تو فریدی وہاں نہیں تھا۔ نوکروں سے معلوم ہوا کہ وہ باہر جا چکا ہے۔ حمید کا ہلوں اور ست آدمیوں کی طرح آہستہ آہستہ دن گذارنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

ٹھیک گیا رہ بجے فریدی کا فون آیا۔ وہ اسے اسی بستی میں طلب کر رہا تھا جہاں سفیروں کی کوئی نیا اسی تھیں، حمید بُری طرح جھلا گیا اور اسی جھلاہٹ میں اس نے چوڑے پائیچوں کا پانچاہہ پہن لیا۔ پانچاہہ پہننے کے بعد قد آدم آئینے پر نظر پڑی اور زیادہ غصہ آیا۔ اسی غصے کے عالم میں اس نے ایک صندوق اٹ پلٹ ڈالا اور وہ شیر وانی نکالی جو آج سے پانچ سال قبل اس کا ایک شاعر دوست اس کے اس سوٹ کے بدالے میں چھوڑ گیا تھا جسے حمید نے بڑے چاؤ سے سلو یا تھا لیں ایک بار بھی پہننے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہوا یہ کہ اس عوای شاعر پر ایک سرمایہ دار لڑکی رسمجھ

”یہ لوگ اچھی طرح روشنی میں آگئے ورنہ پہلے اس سفارت خانے میں یہ بھی سنایا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم یا اُس کے اعزہ کی خوبی زندگیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور ہو سکتا ہے کہ نہیں اس پر یقین بھی آ جاتا۔ لیکن....!“

فریدی کچھ کہتے رک گیا اور پھر بولا۔ ”آؤ....!“

وہ عمارت سے پھر کپڑاٹھ میں آگئے۔ حید اُس سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”میا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اس عمارت کی خلاشی لے سکیں؟“

”میں پہلے بھی دیکھے چکا ہوں لیکن ڈاکٹر ڈریڈیا اُس کا کوئی ساتھی یہاں نہیں دکھائی دیا البتہ اپری منزل کے ایک کمرے کی دیواریں داغ دار ضرورتی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہ نشانات گولیوں ہی کے ہو سکتے ہیں۔“

”آہات تو....!“

”کچھ بھی نہیں حید صاحب۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بناء پر اس عمارت کا رہنے والا رکھا گیا۔ یہ خود بھی ریو اور رکھنے کا جائز ہے اور اگر وہ ریو اور رکھتا ہے تو اسے دنیا کا کوئی قانون عمارت کو چھلنی کر دالنے سے نہیں روک سکتا۔“

”جب پھر ہم اپنا وقت یہاں کیوں برپا کر رہے ہیں۔“

فریدی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ حید چپ چاپ کھڑا درہ اور رکھتا رہ۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ تقریباً سارے ہی آفسر اسے بڑی طرح گھور رہے تھے۔

”اگر کہتے تو میں واپس جاؤں؟“ حید نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ تو میں ایک مشاعرے میں ڈرکت کے لئے جاہی رہا تھا کہ آپ کافون ملا۔ اور میں مشاعرے کی صدارت سے محروم ہو گیا۔“

”چونچ بند کرو اپنی۔“ فریدی نے ناخن ٹھکوار لجھے میں کہا اور پھر بڑی تیزی سے باہر نکل کر اپنی لاکی طرف چلا۔ حید بھی جھپٹا لیکن اتنی دیر میں فریدی کی لئنکن اشارت ہو چکی تھی۔ حید نے اُن لئکنچنے کی کوشش نہیں کی۔ کرتا بھی کہتے کیونکہ وہ خود موڑ سائیکل پر آیا تھا۔

فریدی کی کار آگئے اور موڑ سائیکل اُس کے پیچے فرائٹ بھر رہی تھی ویسے یہ اور بات ہے کہ حید اس کے رویے پر چراگ پا ہو گیا ہو۔ کار اور موڑ سائیکل سڑکوں پر دوڑتی رہیں۔ حید نہیں کھوس کا تھا کہ اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ آخریک بیک وہ کہاں کے لئے چل پڑا تھا۔ وہ موڑ

وہ ایک راہداری میں داخل ہوئے۔ لاش سامنے ہی پڑی ہوئی تھی۔

”یہ آپ کس بناء پر کہہ رہے ہیں کہ اُسے یہاں نہیں قتل کیا گیا۔“

”اس کا لباس خون سے چکنا ہوا ہے لیکن فرش پر خون کا ایک ہلاکا سادھہ نظر آرہا ہے۔ ایر معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں زیادہ مقدار میں خون بہا ہو۔“

”اور متول کے متعلق کیا بتایا گیا ہے؟“

”وہ سفارت خانے کے ایک اہلکار کا عزیز تھا اور ابھی حال میں باہر سے آیا تھا۔“

”اس کا پاسپورٹ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔“

”ہاں.... اور اسے جعلی بھی نہیں کہا جا سکتا۔“

”جعلی کیسے ہو سکتا ہے جب کہ سفارت خانے ہی سے اس کا تعلق ہے۔“

”یہ ضروری نہیں ہے۔“

”کیا آپ کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ڈریڈیاب بھی یہیں موجود ہے۔“

”کیا میں نے پہلے کبھی یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ مجھے تو نہیں یاد پڑتا ہے کہ میں نے یہ کہا ہو کہ ڈاکٹر ڈریڈیا اسی عمارت میں موجود ہے۔“

”پھر کیا یہ آدمی یہاں پچھلی رات جھک مارنے آیا تھا۔“

”یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے جس کا تعاقب ہم نے پچھلی رات کیا تھا۔ کیا ہم اس کی شکل دیکھ سکتے تھے۔ البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ کبھی جا سکتی ہے کہ یہ انہیں چاروں میں سے ایک ہے۔“

”پھر آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟“

”فی الحال کسی پر بھی نہیں.... تمہیں آخر نتیجے پر پہنچنے کی جلدی کیوں پڑ جاتی ہے۔“

”تاکہ جلد فیصلہ ہو اور اپنی گردن چھوٹے۔“

”جلد فیصلہ ہونے کا امکان نہیں ہے۔“

حید صرف ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہا گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”لیکن آپ نے مجھے کیوں بلا یا تھا۔“

”یہی دکھانے کیلئے۔ اگر میں پچھلی رات اس عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کرنا تو اس لاش کا پتہ بھی نہ چلتا۔ یہ لوگ اسے اتنی دلیری سے یہاں ڈال کر پولیس کو اطلاع نہ دے سکتے۔“

”لیکن اس سے کیا فائدہ ہوا؟“

سائکل پر تھا۔ ورنہ کم از کم اتنا تو معلوم ہی کر لیتا کہ اب کہاں رکنا پڑے گا۔
چھپلی رات فریدی نے جو کچھ بھی کیا تھا حمید اس سے مطمئن نہیں تھا لیکن اس کے باوجود
بھی اس کی موڑ سائکل فریدی کی کار کے پیچے دوڑ رہی تھی۔

لے نے مسکرا کر کہا۔ ”آج یہ نیا خط کیسا؟“

”کیوں...؟“ حمید پھر کھانے والے انداز میں پڑا۔

”اس نے کہ ایک مولوی نے اپا صندوق چوری ہو جانے کی روپورٹ درج کرائی ہے۔“

”تم میرے قوی لباس کا نہ اق نہیں ادا سکتیں۔“ حمید کو حجی محض آگیا۔

”کس قوم سے تعلق رکھتے ہو؟“ ریکھانے پڑے تین بچے میں پوچھا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا

کہ قوم اور قوی چیزوں کا تذکرہ کرنے والے مخزوں میں سے تم بھی ہو۔“

”زبان کو لگام دو۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔“

”تم اپنے قوی لباس میں بالکل بدہ معلوم ہوتے ہو۔“

حمید نے جلاہست میں موڑ سائکل اشارت کی۔

”ارے.... ہاں.... قوم کے بیٹے.... تمہارے لئے ایک غیر قوم کی لڑکی کا پیغام ہے

میری سلطنت!....!“

”کیا....؟“ حمید نے حیرت سے کہا اور مشین بند کر دی۔ میری سلطنت کے متعلق اس کے

افریدی کے علاوہ اور کسی کو علم نہیں تھا۔

”وہ آج نوبجے رات کوئے پول میں ملے گی۔ تمہاری عدم موجودگی میں فون آیا تھا۔ میں بتانا

بھول گئی۔“

”شکریہ۔“ حمید کچھ سوچتا ہوا بڑا بڑا۔ ”اچھا... جیجے ہو...!“

وہ آفس سے گھر آگیا۔ فریدی موجود تھا۔ حمید سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور قوی لباس

سے پیچا چھڑانے کے بعد عسل خانے کی راہی۔ قوی بخار کی ابتداء تفریح سے ہوئی تھی لیکن دفتر

میں تفریح اور بخار دونوں نے بیک وقت سر سام کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جیسے جیسے لوگ ہنستے تھے

سر سام میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میری سلطنت کا تذکرہ آتے ہی وہ بالکل معمول پر

اگیا ہو۔ پھر نہ صرف اس کا قوی لباس اتر گیا بلکہ قوم پرستی کے سلسلے میں اس نے دل ہی ذل میں

جو تقریبیں تیار کی تھیں وہ بھی طلاق نسیان کی نذر ہو گئیں اور وہ سوچنے لگا۔ دنیا کے سارے آدمی

بھائی ہیں کوئی کالی مٹی سے بنا ہے اور کوئی سفید مٹی سے۔ زمین ایک ہی ہے اور اس پر چھایا ہوا

آسمان بھی مختلف حصوں میں تقسیم نہیں ہے۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ میری سلطنت کی اصلیت کیا تھی۔ وہ یہ بھی

بھول گیا کہ خود کا کثر ڈریڈ کے آدمیوں نے میری سلطنت کے متعلق بہت کچھ کہا تھا۔ یہ تو بہت

پھر وہی لڑکی

ایک بار حمید کی موڑ سائکل کار کے برابر آگئی اور فریدی نے بلند آواز میں کہا۔ ”تم دفعہ
ہو جاؤ۔“

”بلیا کیوں تھا؟“

”اس نے نہیں بلایا تھا کہ تم کسی محفل میں لکھنے کے بھانڈ کو نکلتے دینے کے ساز و سامان
سمیت آؤ۔ یقین رکھو کہ آج کی اس حماقت کے لئے تمہیں کافی بھگتا پڑے گا۔ کیونکہ تم نے ڈیوٹ
کے اوقات میں ڈسپلن کو نظر انداز کیا ہے۔“

حمید نے اگلے ہی موڑ پر اپنی موڑ سائکل گھما دی۔ اس کے ذہن میں قاسم کا پیشہ جسے
فریدی کے لئے تھا اور اس نے تھیہ کر لیا کہ وہ اسی بھیت میں آفس بھی جائے گا۔ آخر

”میرے ٹھیکنے سے گونج رہا تھا اور اس نے تھیہ کر لیا کہ وہ اسی بھیت میں آفس بھی جائے گا۔“
فریدی نے اس کے لباس پر کیوں نکتہ چینی کی۔ اسے ڈسپلن کے خلاف کیوں قرار دیا۔

وہ کسی بناستی اور مینڈنک کا سادا ماغ رکھنے والے لیدر کی طرح قوی لباس کے مسئلے پر جنک
مانے لگا۔ ایک لبی چوڑی تقریر تیار کی اور موڑ سائکل فرانے بھرتی رہی۔

آخر کار وہ دفتر پہنچ گیا اور اسے جس نے بھی دیکھا تھی کے مارے دوہر ا ہو گیا۔ لیکن کیا جال
کہ حمید کی سنجیدگی میں فرق آ جاتا۔

وہ نہایت اطمینان سے سارا دن دفتر میں فائیلین الٹا پلٹا رہا اور آفس بند ہونے کا وقت
ہوتے ہی اٹھ گیا۔ لیڈی انپکٹر ریکھا سے دن میں کئی بار ملاقات ہوئی تھی لیکن اس نے اس کے

لباس کے متعلق اظہار خیال نہیں کیا تھا اور حمید کے اندازے سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ”
ہمیشہ سے یہی لباس استعمال کرتا آیا ہو۔“ دیے حقیقت یہ تھی کہ آفس والوں نے آج تک اسے

پا جائے میں نہیں دیکھا تھا۔

شام کو جب وہ واپسی کے لئے موڑ سائکل کی طرف جا رہا تھا ریکھا سے پھر ڈبھیز ہو گئی اور

”جب تم نے میرے بازو میں سوئی چھوٹی تھی اور تم بڑی طرح خوفزدہ تھیں۔“
اور پھر جب میں نے اخبار میں آپ کا نام دیکھا تو میرا دم نکل گیا اور وہیں سے مجھے شہید
ہو گیا کہ دھوکا دیا جا رہا ہے۔“

”کیوں تمہیں دھوکا کس طرح دیا گیا؟“

”میں دراصل ایک نہ ہی خیال کی لڑکی ہوں۔ کثرہ من کی تھوڑک پروٹشنٹ لوگوں کو دکھے
کر میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ لیکن کچھ دن پہلے کی بات ہے میری ملاقات اپنے ہی
فرتے کے ایک پادری سے ہوئی۔ ہم اکثر ملتے رہے اُس نے مجھے بتایا کہ پروٹشنٹ لوگوں کا ایک
گروہ ہمارے فرتے کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ میں نے اس کیلئے کام کرنے پر رضامندی
ظاہر کر دی۔ اُس رات ہمارے فرتے کا ایک آدمی میرے ساتھ تھا اور اُس نے خوفزدہ ہو کر بتایا
تھا کہ یہاں مختلف فرتے کے کچھ خطرناک آدمی موجود ہیں اور غالباً ہماری ہی تاک میں یہاں
بیٹھے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بات بڑھے اور جھکڑا ہو جائے۔ پھر اُس نے مجھے اپک سوئی دی اور کہا کہ یہ
اگر ایسا کوئی واقعہ آئے تو میں اُسے حملہ آور کے جسم میں کسی جگہ چھوڑو۔ پھر آپ میری میر
پر آگئے اور میں یہی سمجھی کہ آپ بھی ہمارے دشمنوں ہی میں سے ہیں۔ یہ ہے پوری داستان۔“
”لیکن تمہیں شہید کیوں ہوا ان لوگوں پر۔ کیا انہوں نے خصوصیت سے میری ہی طرف
اشارہ کیا تھا؟“

”نہیں.... آپ کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔“

”پھر شہید کیوں اور کیسے ہوا؟“

”مجھے شرم آتی ہے بتاتے ہوئے۔ بُس آپ یہ سمجھ لجھ کہ یہ بدمعاشوں کا کوئی گروہ ہے جو
بھول بھالی لڑکیوں کو اپنے جاں میں چاہتا رہتا ہے۔“

”نہیں مجھے اس کے متعلق ضرور بتاؤ۔ تم جانتی ہی ہو کہ میرا تعلق کس سمجھے ہے۔“

”وہ دیکھئے طارق روڈ پر ایک عمارت ہے تو یہ بلڈنگ۔ اُس کی تیسری منزل پر ایک فرشتہ
صورت آدمی رہتا ہے۔ اُس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ وہ ہمارے ہی فرتے کا ایک بہت بڑا عالم ہے
لیکن مختلف گروہ کے کسی بدجنت نے اُس کی زندگی برپا کر دی ہے۔ اُس پر کوئی ایسا زبر آزمایا گیا
تھا جس نے اُسے ذہنی اعتبار سے مجھوں کر دیا اور وہ قادر القلعوں کی زندگی سر کر رہا ہے۔ انہوں
نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اُس کی دیکھ بھال کر سکوں تو یہ ایک کار ثواب ہو گا۔ میں نے منظور
کر لیا۔ مگر آپ سے کیا تباو۔ شرم کی وجہ سے میری زبان نہیں کھلتی۔“

دور کی بات ہے۔ حمید خود ہی ایک بار اُس کی ذات سے ایک تین تجربے کا ہیئتکار ہو چکا تھا لہذا اسی
صورت میں یہی کہنا چاہئے کہ اُس کے ستارے ہی گردش میں تھے۔

”حمد آٹھہ ہی بجے سے پول جامنچل ضروری نہیں تھا کہ اُس وقت میری سلطنت بھی موجود
ہی ملتی کیونکہ ریکھا کے بیان کے مطابق اُسے نوبجے کا وقت دیا تھا۔

یہ کہنا غلط ہو گا کہ حمید نے اس ملاقات کے بارے میں سرے سے کچھ سوچا ہی نہیں۔ اُس
نے اس مسئلے پر کتنی پہلوؤں سے غور کیا تھا لیکن چونکہ اُس نے پہلے ہی فرض کر لیا تھا کہ میری
سلطنت مخصوص ہے اس لئے وہ اس کے خلاف کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ذا کثرہ ریز
کے لئے کام ضرور کر رہی ہے لیکن نادانیگی میں۔ اُسے علم نہیں ہے کہ وہ کس کے لئے کام
کر رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی حمید کی نظرتوں سے اسی ہی صدھا مثالیں گذر بھی تھیں اس لئے وہ
اپنے اسی خیال پر جمارا۔

ٹھیک نوبجے اُسے میری سلطنت دکھائی دی۔ حمید نے اُسے اشارہ کیا اور وہ بڑے پُر اشتیاق
انداز میں اُس کی طرف بڑھی۔ حمید اُس کی چال کو بڑے انتہا ک سے دیکھتا ہوا دل ہی دل
قربان ہو رہا تھا۔ اُس بڑی کے ہر انداز میں بڑی سیکس اپیل تھی۔

پہلے تو وہ اُسے دیکھ کر مسکراتی تھی لیکن قریب پہنچنے پر کچھ گہرا اُسی نظر آنے لگی۔
حمدید نے بڑی بُرپا تپاک مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا۔

”میں دراصل اقبال جرم کرنے آئی ہوں۔“ اُس نے کپکاپا ہوئی ہی آواز میں کہا۔

”بھوول جاؤ اُس دلقے کو۔“ حمید نے لاپرواٹی سے کہا۔

”لیکن مجھے آپ کے اس روایہ پر حیرت ہے جتاب۔“

”کیوں؟“

”ایک مجرم آپ کی نظرتوں کے سامنے ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ تم دھوکے سے کسی کے جاں میں پھنس گئی ہو۔“

”آپ کیا جانیں۔“ میری نے حیرت سے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“

”میں تو سمجھ تھی کہ اب گردن چھڑانا مخالف ہو جائے گا۔“

”تم نے ناحق کسی ایسے فضول خیال کو دل میں جگہ دی تھی۔ میں تو اُسی دن سمجھ گیا تھا۔“

”کس دن؟“

”نہیں مجھے ضرور بتاؤ۔“

”اُس نے ایک دن مجھ پر حملہ کیا۔ میں اپنی پوری قوت سے اُس کے مقابلے میں تیار ہو گئی اور اُس نے بنس کر کہا کہ روزانہ کتنی ہی لڑکیاں اسی بہانے سے اُس کے لئے لائی جاتی رہی ہیں۔ میں یہ سن کر سنائے میں آگئی۔ لیکن خدا انکے کہ کسی نہ کسی طرح اس وحشی سے خود کو بچانے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ دو دن تک اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد آج آپ سے ملی ہوں۔“

”فکرنا کرو۔ میں انہیں ٹھیک کر دوں گا۔ کیا تم اُس مقام سے واقف ہو جاں آن کا قیام ہے؟“

”ہاں میں جاتی ہوں۔“

”مجھے بتاؤ۔ میں اسی وقت اُن کا قلع قلع کر دوں گا۔“

”وہ ایک بڑی گندی سے بستی میں رہتے ہیں ارجمند پورے میں۔“

”ارجمند پورے میں؟“ حمید نے حیرت سے دہرا لایا۔

”جی ہاں... اُن کا کہنا ہے کہ وہ دہا رہ کر غریب آدمیوں میں تعلق کرتے ہیں۔“

”پتہ بتاؤ؟“

”زبانی بتانا بڑا مشکل ہے۔ بیچ دریچ گلیاں ہیں۔ لیکن میں آپ کو وہ مکان دکھا ضرور سکتی ہوں جہاں وہ رہتے ہیں۔“

”میں اسی وقت دیکھوں گا۔“

”میں ضرور چلوں گی آپکے ساتھ۔ اُن کے خلاف میرے سینے میں آگ بھری ہوئی ہے۔“

”دفعۂ حمید کی نظر قاسم پر پڑی جو اُسی کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کا دم نکل گیا قبل اس کے کہ وہ میری سے اٹھنے کے لئے کہتا قاسم سر پر سوار تھا۔“

”ساماں لیکم حمید بھائی۔“ اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا اور میری کچھ نزوس سی نظر آئے گئی۔ حمید کا بھی بھی حال ہوا تھا۔

”اُرے حمید بھائی... ہی ہی... کتنا ڈھونڈا کہاں کہاں ڈھونڈا مگر تم ہو کہ تمہارا کہیں پتہ ہی نہیں۔“

”میں اس وقت اچھے موہن میں نہیں ہوں۔“ حمید نے آہستہ سے اردو میں کہا۔

”اردو نہیں سمجھتی کیا؟“

”نہیں تم اس وقت چلے جاؤ۔“

”اس کی بڑی بہن نہیں آتی کیا...؟“

”قاسم کبواس نہ کرو۔ چپ چاپ اٹھ جاؤ۔“

”میں تو نہیں اٹھوں گا... ہی ہی... دیکھتا ہوں تم کیا کرتے ہو... ہی ہی ہی۔“

”قاسم آج بڑا بے جھک ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ ورنہ وہ تو عورتوں کی موجودگی میں بعض اوقات ہاتھ پر بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔“

”میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“ حمید نے کہا۔

”تم مجھے پاگل کنوں کے حوالے کر دو لیکن میں آج اس کی بڑی بہن سے ضرور ملوں گا۔ ملوادوں...!“

”ارے تم غلط سمجھے۔ یہ اُس دن والی لڑکی نہیں ہے۔“ دفعۂ حمید کا موڈ بل گیا۔

”اے جاؤ۔ کسی اور کو اکو بیٹا۔“

”یقین کرو پیارے۔“

”کیوں یقین کروں۔ کیا میں اندر ہا ہوں۔“

”آؤ چلیں۔“ حمید جھلا کر میری کی طرف مڑا۔

”یہ کون صاحب ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں؟“

”اڑے یہ یو نہیں ہیں تم چلو۔“

”اُبے تم خود ہی ہو گے یو نہی۔ بلکہ جو نہی... تو نہی وغیرہ۔“ قاسم بگڑ گیا۔

”کیوں جتاب! کیا بات ہے۔ آپ کیوں خفا ہو رہے ہیں؟“ میری نے قاسم کو مخاطب کیا۔

”خفا ہونے کی بات نہیں۔ یہ ایک چار سو میں آدمی ہے۔“ قاسم نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”اس کے ساتھ کہیں نہ جائیے ورنہ یہ آپ کو کوئی میں دھکیل دے گا۔“

میری اُس کے لب ولجھ پر بے اختیار ہٹنے لگی۔ قاسم کا لیکچہ گز بھر کا ہو گیا اور حمید کی جان نکل گئی۔

”اٹھو جلدی کرو۔“ اُس نے کہا۔

”نہیں یہ بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ میری بولی۔

قاسم کی باٹھیں جو کھلنے سے باقی رہ گئی تھیں وہ بھی کھل گئیں اور اُس نے حمید سے کہا۔

”نہیں یہ تمہارے ساتھ ہر گز نہیں جائیں گی۔ اگر تم زبردستی کرو گے تو خون خراہہ ہو جائے گا۔“

”بڑے آئے کہیں کے انگی واہ۔“

”قاسم گن گن کر بدالے لوں گا۔“ حمید نے اردو میں کہا۔ اُسے حیرت تھی کہ آج قاسم کی

کلایپسٹ کیسی ہو گئی۔

"میرے ٹھینگ سے۔ میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔ کیا صرف تم ہی مزہ کرنا جانتے ہو۔" میری نے اپنے بیگ سے چالکیٹ کا پیکٹ نکالا اور قاسم اس پر نظر جانے ہوئے منہ چلانے لگا۔ اب حمید کو میری پر بھی غصہ آچلا تھا۔ آخر دھنیتی کیوں نہیں۔ پھر قاسم کی طرف اس نے دیکھا جو لچائی ہوئی نظرؤں سے چالکیٹ کے پیکٹ کو گھورا تھا۔

میری نے پیکٹ چھڑا کر چالکیٹ نکالے اور پکھ جید کی طرف بڑھا دیئے کچھ قاسم کی طرف۔ قاسم نے کچھ اس انداز میں جھپٹا مارا جیسے شہبہ رہا ہو کہ کہیں حمید انہیں بھی نہ اچک لے جائے۔ اس نے بھاڑ سامنہ کھول کر سارے ٹکڑے ایک ساتھ رکھ لئے اور حمید اسے غصیل نظرؤں سے گھورتا رہا۔

"پھر انہیں بھی لے چلئے کیا حرج ہے۔" میری نے مسکرا کر کہا۔ "یہ آپ کے کوئی بے تکلف دوست معلوم ہوتے ہیں۔"

حمدیڈ چالکیٹ کے ٹکڑوں کو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اس نے جلا کر کہا۔ "نہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

"آپ کوئی میں گرنے جا رہی ہیں سمجھیں۔" قاسم انگلی اٹھا کر بولا اور پھر چوک کر اس طرح آنکھیں چھاننے لگا جیسے نیند کے خلاف جدو جہد کر رہا ہو۔ دفتاراً کی کھڑی ہو کر بولی۔

"چلے۔"

مگر قاسم خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر بچھی شدید ترین نیند کا حملہ ہوا ہو۔

حید نے محوس کیا کہ لڑکی کچھ بوکھلا سی گئی ہے۔ اس کا ما تھا ٹھنکا اور وہ ٹکڑوں سے قاسم کو دیکھتا ہوا لکلوک روم کی طرف بڑھا۔ لکلوک روم کی تین بڑی کھڑکیاں ڈائینگ ہال کی طرف ھلتی تھیں۔ حید نے بیگ پر سے اپنا الشرا آنارتے ہوئے دیکھا کہ قاسم کری کی پشت سے لٹکا ہوا بے خبر سورہا ہے۔

حید کے ہاتھ میں اب بھی چالکیٹ کے ٹکڑے دبے ہوئے تھے۔ اس نے جیب میں دل لئے پھر وہ دروازے کی طرف فرا اور مسکرا کر بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ اس احمدق سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

"جج.... جی ہاں۔" میری چوک پڑی۔ "جی ہاں.... میں نے اتنا لبا اور اتنا موٹا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔"

"ہاں.... وہ ہر معاملے میں غیر معمولی ہے۔ آئیے۔"



ڈاکٹر ڈریڈ انتہائی غصے کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ لیکن اب وہ اُس عمارت میں نہیں تھا جہاں اُس نے کچھلی رات گزاری تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں چاروں طرف لوہے کی الماریاں دیواروں سے لگی رکھی تھیں۔ یہاں ان الماریوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اُس نے ایک الماری کھولی۔ اُس کے اندر فون رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کسی کے نمبر ڈائل کئے اور ماٹھ پیس میں چکھاڑا نے لگا۔ "کون ہے... اوه... کیا کرز ہے ہوتم لوگ... کر گیگ کو بھیجو۔" اُس نے رسیورز کھر کر پھر الماری بند کر دی اور پہلے ہی کے سے انداز میں ٹھٹھے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازے کا پر دھٹا اور ایک آدمی اندر دا خل ہوا۔

"کیا خبر ہے؟" ڈاکٹر اسے خون خوار نظرؤں سے گھوڑتا ہوا بولا۔ "سب ٹھیک ہے جناب میری سٹھنگل انہیں ضرور لائے گی۔ اس وقت تک کی روپرٹ ہے کہ وہ دونوں میچ پول سے باہر نکل آئے ہیں۔"

"لیکن فریدی کہاں ہے؟"

"وہ میرا خیال ہے کہ اُن دونوں کی گمراہی کر رہا ہو گا۔"

"ضروری نہیں ہے کہ وہ دھوکا کھا کر یہاں تک چلا ہی آئے۔ کر گیک عقل استعمال کرنا سیکھو۔" مجھے یقین ہے جناب ک کیپن حید نے اس سے اس دعوت نامے کا نزد کرہ ضرور کیا ہوا۔ اب وہ بھی کیپن حید کی طرح بے قوف نہیں ہے۔ وہ یقیناً بھی سمجھے گا کہ ان لوگوں کے لئے کوئی جال پچھایا گیا ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں تک چلا ہی آئے۔

"کچا کام....!" ڈاکٹر ڈریڈ نے بُردابا منہ بٹایا۔ "مگر تم کیا جانو کہ کس قسم کے آدمی سے مقابلہ ہے۔ کچھ بھی ہو جھنے دو دن کے اندر اندر فریدی اور فتحی کی لاشیں چاہئیں۔"

"هم انتہائی کوشش کر رہے ہیں ڈاکٹر۔"

"اوہ یہ بھی غالباً کوشش ہی ہے۔" ڈاکٹر نے طنزیہ لمحے میں کہا۔ "کہ تم نے اس بے وقوف لڑکی کو اس مہم پر روانہ کیا ہے۔"

"ہم تو آپ ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔" کر گیک کے لمحے میں بھی ڈاکٹر

چڑہ پر دے سے اندر جھاک رہا تھا۔ ”عنی.... عنی.... عنی“ وہ دانت نکالے ہستارہا پھر بولا۔ ”میا میں اندر آجائوں؟“

”آجاؤ...!“ ڈریڈ اسے گھورتا ہوا غریلای۔

”آج تین بیجے چاند زمین پر اتر آئے گا۔“ زرد پوش فرشتے نے اندر آکر پیشین گوئی کی۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا۔ ”میرا چاند کہاں ہے۔ خدا کے لئے اُسے بلادو۔“

ڈاکٹر ڈریڈ مسکرایا اور بولا۔ ”ایک نہیں دو چاند...!“

”ہائے...!“ زرد پوش فرشتے اچھل کر اپنا سینہ پینٹنے لگا۔ وہ اس وقت زرد الباۓ اور ڈاڑھی میں بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر ڈریڈ نے پھر فون والی الماری کھوئی اور ماڈ تھر پیس میں بولا۔ ”کریگ...!“ ڈالی اور مونا کو یہاں بھیج دو۔ میں تفریخ کے موڈ میں ہوں۔“

”ہائے...!“ ہائے...! ڈالی... اور مونا۔“ زرد پوش فرشتے دانت پر دانت جانے سکاریاں لینے لگا۔

ڈاکٹر مسکراتا رہا۔ کچھ دیر بعد دوجوان اور سفید قام لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ ایک نارنجی اسکرت میں تھی اور دوسرا یہ لکھے نہیں اسکرت میں۔ ڈاکٹر ڈریڈ نے زرد فرشتے کی طرف اشارہ کیا۔ جو خاموشی سے کھڑا ٹکٹیں جھکا رہا تھا۔

وہ دونوں اُس کے قریب پہنچ کر بولیں۔ ”کیوں ڈار لگ۔“

”عنی... عنی... عنی...“ تم دونوں میری زندگی ہو۔ میری حیات ہو۔ آؤ... آؤ...“ اُس نے دونوں ہاتھ پھیلادیئے اور ایک لڑکی بھی دونوں ہاتھ پھیلادیکر جھٹی لیکن قریب پہنچ کر جیسے ہی زرد پوش فرشتے نے اپنی طرف کھینچتا چاہا اُس نے اُسکے گال پر تھپر سید کر دیا۔

”آرے...!“ زرد پوش فرشتے بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ تم نے کیا کیا مونا...!“ دوسرا لڑکی نے زرد پوش فرشتے کو پکلتے ہوئے کہا۔ ”تم بڑی کمیں ہو۔“

پھر دوسرا لڑکی اُس کا گال سہلانے لگی جس پر تھپر پڑا تھا۔

”تم خود کمیں ہو ڈالی۔ تھیں کیا حق ہے کہ میرے محبوب کا گال سہلاو۔“

”جہنم میں جائے تمہارا محبوب۔“ ڈالی نے بھی جھلا کر اُس کے گال پر تھپر جز دیا۔ زرد پوش فرشتے پھر اچھل کر پیچھے ہٹا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گونھا ہو گیا ہو۔ مونا نے پھر اُسے پکڑ لایا تھا

ڈریڈ نے طفر کی تنجی محسوس کی اور اسے جیرت سے گھومنے لگا۔ ”میں نے غلط نہیں کہا اکثر۔“ کریگ دلیری سے بولا۔ ”میں باتا ہوں کہ آپ انصاف پسند ہیں۔ اس لئے آپ پر طفر کرنے کے بعد بھی زندہ ہوں گا۔“

”ہاں... میں انصاف پسند ہوں۔“ ڈاکٹر ڈریڈ غصیل آواز میں غریل۔ ”تم اپنا مطلب بیان کرو۔“ ”کیا آپ سے غلطیاں نہیں ہوتیں؟“

”شاذ و نادر...!“ لیکن میں انہیں جلد ہی سنبھال لیتا ہوں۔“

”بیتیری ایسی بھی ہوں گی جنہیں آپ نہ سنبھال سکے ہوں گے۔“ ”یہ بات جلد ہی ختم ہونی چاہئے۔ وضاحت کرو۔“ ڈاکٹر غریل۔

”جب میری سکھلن سے ایک غلطی ہو جگی تھی تو اُس غلطی کا اعادہ دوسرا بار کیوں ہوا۔“ میں زہریلی سوئی والے واقعے کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ آخر وہی سوئی تیگم ارشاد کے یہاں کرامہ روپر تر پر کیوں استعمال کی گئی جب کہ کرٹل فریدی اس واقعہ کی پیشی بھی کر اچکا تھا۔

ڈاکٹر ڈریڈ کی غراہت قیقہے میں تبدیل ہو گئی اور وہ قیقہہ بھی طویل ہوتا چلا گیا لیکن کریگ بڑی طرح کا بیب پر رہا تھا۔

دفعہ اُس طرح خاموش ہو گیا جیسے کوئی مشین چلتے چلتے رک گئی ہو۔

پھر وہ دہاز۔ ”تم مجھے الحق سمجھتے ہو۔“ غلطی نہیں حکمت عملی تھی۔ تم اُس عورت کو کیا سمجھتے ہو۔ ایسی عورتیں بہت کم میری نظروں سے گذری ہیں۔ وہ صرف قانون سے ڈرتی ہے اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پولیس بھی اُس میں دلچسپی لینے لگے۔ اس طرح وہ بوکھلا جائے گی اور پھر...! پھر میں اُسے دیکھوں گا کہ اُس کے اعصاب فلاں کے ہیں یا پتھر کے۔ انور کے معاملے میں اُس کی تنبیہ بھی محض فضول اور لغو تھی۔ وہ میرا کیا کر سکتا ہے۔ مقصد یہی تھا کہ اُسے چاروں طرف سے چھیڑا جائے اور وہ پریشان ہو کر میرے مطالبے پورے کرے۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو وہ آج بھی گھوڑے گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی گلیوں میں بھکتی پھر رہی ہے۔“

”جج...!“ جی ہاں...! میں دلکھ رہا ہوں۔“

”دفعہ ہو جاؤ۔“ ڈاکٹر ڈریڈ دروازے کی طرف ہاتھ کر دہاز۔ کریگ اُنہی پاؤں چلتا ہو اور دروازے سے نکل گیا۔ شاید اُسے خدا شما کہ ڈاکٹر ڈریڈ کی طرف پشت ہوتے ہی موت آدبو پے گی۔

ڈاکٹر ڈریڈ پھر ٹھیٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ چوک کر دروازے کی طرف مڑا۔ زرد پوش فرشتے کا

میکن اُس نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ حیرت سے ڈاکٹر ذریث کی طرف دیکھا رہا۔
”یہ چاند پسند آئے تمہیں۔“ ڈاکٹر ذریث نے مسکرا کر پوچھا۔

”جسے تو ہیں۔“ فرشتے نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”مگر مارتے کیوں ہیں؟“
اس بارہ مونا نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کی کمرپر لات رسید کر دی اور وہ منہ کے مل فرش پر
چاکر لے پھر ڈالی نے اُسے اٹھنے نہیں دیا۔ اُس کی پشت پر سوار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر
سہلانے لگی تھی۔

دفعہ الماری میں رکھے ہوئے فون کی تھنھی بچی۔ ڈاکٹر ذریث نے رسیور انٹھالی۔ ادھر دونوں
چاند زرد پوش فرشتے کی کھوپڑی سے سورج طلوع کرتے رہے۔

”ہیلو.... کون... کر گیک... کیا بات ہے؟“
”اگر بڑھو گئی ڈاکٹر۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”کیپشن حیدر جیکی میں نہیں بیٹھا۔ وہ
اُسے موڑ سائیکل پر لے گیا۔“

”اوہ....!“ ذریث غریباً اور شور مچاتی ہوئی لاکیوں کی طرف مڑ کر دھاڑا۔ ”اے لے جاؤ
یہاں سے۔“ اور پھر ماڈھٹھ پیس میں بولا۔ ”میں نے پہلے ہی تمہیں آگاہ کر دیا تھا تم سب گدھے
ہو گئے ہو۔ کیا وہ اُسے گھر لے گیا ہے۔“

”ہاں... ڈاکٹر... پانچ اور گلاریاہ پوچھ رہے ہیں کیا ہم کرتی فریڈی کی کوئی تھنھی میں کھس جائیں۔“
”یقیناً... اگر وہ خونوار کتوں کی غذبنا پسند کریں۔“

”پھر کیا کیا جائے۔“ کر گیک بہت بُوکھالیا ہوا سامعوم ہوتا تھا۔
”اب...!“ ذریث کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہونے دو۔“
”وہ لڑکی...!“

”اُس سے میرا دل بھر گیا ہے۔ اس لئے اُس کے خانجہ ہو جانے کا انوس سمجھے نہیں ہو گا۔
مگر مٹھرو۔ کیا وہ اس قیام گاہ سے واقف ہے؟“
”نہیں ڈاکٹر۔“

”بس تھیک ہے اُسے بھول جاؤ۔“ ذریث کا لہجہ بہت زرم تھا۔ ”لیکن فتح کے لئے جو تدبیر بتا رہا
ہوں اُسے غور سے سنو۔ وہ اپرنگ کاٹھ میں مقیم ہے۔ خیر... سنو... اس وقت تمہارے پاس
کتنے دلیسی آدمی ہیں۔“
”فی الحال آٹھ ہیں۔“

”تمیک... اُن میں سے دو کو گولڈن اسکرپٹین کے اجکشن دو۔ اُن کے پاس دو بھرے
ہوئے روپ اور بھی ہونے چاہئیں اور وہی پرانی تدبیر۔ اُنہیں اپرنگ کاٹھ کے سامنے آتا رہتا ہے اور
تم لوگ باہر چھپے رہنا۔ اُس واقعے کے بعد فتح وہاں ہرگز نہیں رکے گا۔ جیسے ہی باہر نکلے... جس
طرح مناسب سمجھو اُس کا خاتمہ کرو۔ اگر میری یہ تدبیر تمہاری تابعیت کی بناء پر ناکام ہوئی تو...
سمجھتے ہو کہ نہیں... میں ایک رات میں دونا کامیاب نہیں برداشت کر سکوں گا۔“
”لیکن اگر وہ اپرنگ کاٹھ میں نہ ہو تو؟“

”تب پھر کوئی بات نہیں۔“

”دو جانیں بیکار ضائع ہوں گی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”بکواس بند۔“ ذریث غریباً۔ اُب تک ہزار ہاجانیں میرے تجربات کی نذر ہو چکی ہیں۔“

نکل گیا

حموڑ سائیکل فریڈی کی کوئی تھنھی کی کپڑاٹھ میں داخل ہوئی اور پیچھے بیٹھی ہوئی میری سغلکن
نے گھبرا کر کہا۔ ”تم مجھے کہاں لے آئے؟“

”میں نے کہا تمہیں اپنا گھر دکھادوں۔“ حیدر نے کہا۔ حموڑ سائیکل پورچ میں پہنچ کر رک
چکی تھی۔

”نہیں! میں یہاں نہیں ٹھہر ہوں گی۔“ وہ خوفزدہ نظر وہ سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی
اور گاڑی سے کو دیگی۔

”تم قلعے نہ ٹھہر دو۔“ حیدر مسکرا کر بولا۔ ”لیکن میں تمہیں چاہک تک چھوڑنے کیلئے جاؤ گا۔“
”کیا مطلب...؟“

”مطلوب یہ کہ ادھر دیکھو۔“ حیدر نے دائیں جانب اشارہ کیا جہاں دس عدد خطرناک قسم
کے بلڈہاؤٹ کھڑے ہانپ رہے تھے۔ حیدر نے پھر کہا۔ ”تم میرے پاس سے ٹھیک اور یہ تمہارے
حسن کی داد دینا شروع کر دیں گے۔ خوبصورت لاکیوں کا گوشت انہیں بے حد مرغوب ہے۔“

”ہائے میں کہیں کی بھی نہ رہی۔“ لڑکی روپہانی ہو کر بولی۔ ”تم نے بھی دھوکا دیا۔“
”نہیں ڈارنگ میں تمہاری پوچا کروں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔“ حیدر اُس کا ہاتھ پکڑ کر

ڈریڈ کے آدمی میری گرفتاری کرتے اور پھر کہیں نہ کہیں ہمارا پھنس جانا لازمی تھا۔ مگر ڈریڈ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں آنکھیں بند کر کے کونوں میں کود جاؤں گا۔

پھر فریدی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا جو خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ آخر اس نے کہا۔ ”میں تم سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پوچھنا چاہتا کہ اُس رات تم کس سے خوفزدہ تھیں جب کیپن حید کے زہر لیلی سوئی چھبوئی تھی۔“

”میں کیپن کو بتاچکی ہوں مختلف گروہ وہاں موجود تھا۔“

”مگر یہ خواب آور چالکیست کیوں لے پھر ہی ہو؟“

”اوہ.... تو یہ بات ہے۔“ لڑکی ہنسنے لگی۔ ”شاید میں نے غلطی سے خواب آور چالکیست پیش کر دیئے تھے۔ اسی لئے وہ موٹا آدمی ہمارے ساتھ نہیں آسکا۔ ورنہ وہ تو کیپن کو بھی دھمکیاں دے رہا تھا۔ بات یہ ہے جناب کہ مجھے بے خوابی کی شکایت ہے اور میں ایسے چالکیست اپنے پاس رکھتی ہوں جنہیں کھا کر سو سکوں۔“

”بس اسے تو مجھے ہی بخش دیجئے۔“ حید نے فریدی سے کہا لیکن فریدی دھیان دیئے بغیر میری سے بولا۔ ”میری بات کا صحیح جواب دو۔ اُس رات تم کس سے خوف زدہ تھیں۔“

”آپ لوگ پتہ نہیں کیا سمجھ رہے ہیں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”میں اچھی کر دوں گا۔“ حید بولا۔ ”لیکن جب وہ کچھ نہ بولی تو اس نے کہا۔ ”ڈریڈ کے آدمی یقیناً تمہاری گرفتاری کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن تم اس خیال میں نہ رہو کہ وہ یہاں اس عمارت میں قدم بھی رکھ سکیں گے۔ ڈریڈ دوبار میرے ہاتھوں سے ٹکلت کھاچا ہے۔ اگر یہ اُس کے بس میں ہوتا تو کسی صبح میری لاش بھی صہری پر ملتی۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ نہ میکسیکو، میکسas، اولکا ہالیا کنساس نہیں ہے۔“

لوکی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

”اُسے چالک تک چھوڑ آؤ۔“ دفتار فریدی حید کی طرف مڑا۔

”کیوں....!“ حید کے لجھے میں حیرت تھی۔

”میں صرف ڈاکٹر ڈریڈ کو مردیا زندہ چاہتا ہوں اور اُس کے دویا تین ساتھیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں مل سکے گا۔“

”یہ ضرور جانتی ہوگی۔“

برآمدے کی طرف کھینچنے لگا۔

”یہ کیا کرتے ہو۔ میں شور مجاہد ہوں گی۔“

”ضرور مجاہد۔ کوئی یہاں قدم رکھنے کی بھی ہمت نہیں کرے گا۔ یہاں ہمارا راج ہے۔“

میری سفکھن بنے بھی سے آگے بڑھ گئی۔ حید اُسے اندر لیتا ہوا چلا گیا۔ فریدی اندر رونی برآمدے میں موجود تھا۔ اُس نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا۔

”ہم دونوں چڑھ سے سیدھے یہیں آ رہے ہیں۔“ حید بڑے ادب سے بولا۔ ”اب ہم دونوں کو آشیر واد سمجھے۔“

”کیا مطلب؟“

”پہلے میں نے کسی نکاح خواہی کو تلاش کیا تھا مگر جب کوئی نہیں ملا تو مجبوراً سول میرج کر لی۔“

”یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں غلط کہہ رہے ہیں۔“ میری گھبراۓ ہوئے لجھے میں بولی۔

”مجھے زبردستی پکڑ لائے ہیں۔“

”ہائیں.... تم یہ کیا کہہ رہی ہو ڈارلنگ میں سر شیقیت دکھا سکتا ہوں اور کوئی بھی عدالت اسے صحیح تعلیم کرنے سے انکار نہیں کرے گی۔“

حید نے جیب سے وہی چالکیست کے ٹکرے نکال کر اُسے دکھائے جو اسی نے دیے تھے اور پھر بولا۔ ”یہ ہے سر شیقیت اور تمہارا پہلا شوہر میں پول ہوٹل میں بے ہوش پڑا ہے کیا سمجھیں۔ اب سکون سے بیٹھ جاؤ۔“

حید نے اُسے ایک خالی کرسی میں دھکیل دیا۔

”کیا قصہ ہے؟“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا اور حید نے قصہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے شروع ہوا تھا۔

یہ داستان حید نے اردو میں چھیڑی تھی اور میری کا کچھہ وہ دھوال ہو رہا تھا۔

”اور تم مجھے بتائے بغیر چلے گئے تھے۔“ فریدی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔“

”نہیں تم نے بہت اچھا کیا تھا۔ ویسے اگر تم مجھ سے تذکرہ کرتے تب بھی یہی ہوتا۔ ڈریڈ نے اس بار بڑی گھنیا قسم کی چال چلی تھی۔“

”کیا مطلب....؟ میں نہیں سمجھتا۔“

”ظاہر ہے اس دعوت ناے پر میں تمہیں تھا بھیجا اور خود چھپ کر تمہاری گرفتاری کرتا اور

”نچھے شہر ہے۔“

”یکوں۔ تم نہیں ذا کٹڑ ذریڈ کا پتہ بتاؤ۔ ممکن ہے تمہیں معاف کر دیا جائے۔“

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ لوگ کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔“

”اسے باہر چھوڑاؤ۔“ فریدی گرج کر بولا۔ ”میر اور اپنا وقت بر بادنہ کرو۔“

حید اس تجویز پر پاگل ہو گیا تھا۔ مگر وہ چب چاپ انھا اور میری سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”انھو...!“

نہ جانے کیوں میری پہلے سے بھی زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔

”اٹھتی کیوں نہیں چلو۔“ حید جھلا گیا۔

”نہیں... میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”اب کیا میں اسے باہر لے جانے کے لئے اونٹ گاڑی کا انتظام کروں؟“ حید پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

فریدی کچھ نہ بولا۔ اُس نے پھر کتاب انھا لی تھی۔

”چلو... خدا کے لئے انھو۔“ حید پھر اُس کی طرف متوجہ ہو۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ اس طرح جانے سے تو بہتر یہی ہے کہ میں یہیں خود لکھی کر لوں۔“

”تو پھر وہ لوگ تو یہاں گھنسنے کی ہست نہیں کر سکیں گے۔ یہ بہت مشکل کام ہے کہ وہ اپنے کسی آدمی کو یہاں سے نکال لے جاسکیں۔“ فریدی نے کتاب پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

”وہ شخص جس کی معلومات اتنی وسیع ہوں۔“ لڑکی بڑی بڑی۔ ”اسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔“

حید بوکھلا کر فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”لہذا بہتر یہی ہے کہ جو کچھ میں پوچھوں اُس کا صحیح جواب دو۔“ فریدی نے کہا لیکن اُس کی نظراب بھی کتاب ہی پر تھی۔

”میں تیار ہوں۔“ لڑکی نے بڑے خلوص سے کہا اور حید اپنی کھوپڑی سہلا کر مرغ کی بولی بولتا ہوا کسی پر ڈھیر ہو گیا۔

”اُس رات تم کس سے خوفزدہ تھیں؟“

”فخش اور اُس کے ساتھیوں سے۔“

”کیا وہ میں پول میں موجود تھے؟“

”ہمارے شہرات کے مطابق وہ وہیں تھے۔“

”چجھے بھی تھا؟“

”ہاں... وہ بھی تھا۔“

”مگر وہ تو اپنے قد کی بناء پر ہزاروں میں پیچانا جاسکتا ہے۔“

”پتہ نہیں وہ کس طرح اپنا قد لما کر لیتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں وہ کس طرح اپنے قد میں تبدیلی کر سکتا ہے۔“

”مجھے بھی بتایے۔“ حید بول پڑا۔ ”ورنہ میں اب گھوں کی سی آوازیں نکالنا شروع کر دوں گا۔“

”اُس کی عمر ہی سر کس کی ملازمت میں گذری ہے۔ کیا تم نے سر کس کے سخنوں کو بانسوں پر چلتے نہیں دیکھا۔ وہ اوپنج بانس اپنے پیروں پر باندھ کر چلتے ہیں۔ نہ صرف چلتے ہیں بلکہ اکثر اتنی تیزی سے دوڑتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ فخش اس فن کا ماہر ہے۔ اُس کے پاس لکڑی کے مصنوعی بیجیں اُنہیں کے ذریعہ وہ اپنا قد گھٹانا بڑھاتا رہتا ہے۔“

”آپ بالکل تھیک فرمائے ہیں ذا کٹڑ کا بھی بھی خیال ہے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ اُس کی چال میں ذرہ برابر بھی بناوٹ نہیں محسوس ہوتی۔“

”وہ اس فن کا ماہر ہے۔“ فریدی بولا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر اُس سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ اُن دونوں میں کیوں بھن گئی ہے۔“

”آپ کو اس کا بھی علم ہو گا۔“

”ہاں مجھے علم ہے اور آج ہی ہوا ہے۔ لیکن میں تقدیق چاہتا ہوں۔“

”فخش نے ایک یتیم بچی کی پرورش کی تھی۔ اسے بھی اس نے سر کس کے لئے تربیت دی تھی اور اُسے اپنی بھی بیٹی سمجھتا تھا۔ ایک رات ذریڈ کے آدمی نے اُسے سر کس سے اٹھایا اور دوسرا بیٹھ اُس کی لاش سڑک پر پاپی گئی۔“

”اور وہ صرف تیرہ سال کی تھی؟“

”ہاں یہ بھی صحیح ہے۔“ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے تھے۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ذریڈ درندہ ہے میں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔ لیکن اُس کے پھندے میں بھنسی ہوئی لڑکیاں کسی طرح بھی اُس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں۔“

”تم فخش کے آدمیوں کی ٹوہ میں بھی تور ہی ہو؟“

”ہاں.... میں تھی۔ مگر مجھے اُس سے گھری ہمدردی ہے۔ میں مجبور اُس کے خلاف کام

کرتی رہی ہوں۔ آج ہی میں نے ڈاکٹر ڈریڈ کو اطلاع دی ہے کہ فنچ اسپر گک کا مجھ میں ہے۔“

”کہاں؟“ فریدی اسے گھورنے لگا۔

”اپس پر گک کا مجھ میں۔ اگر ڈریڈ کا ایک آدمی میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں ہرگز اسے اس کی اطلاع نہ دیتی۔“

”اس وقت تمہارا کیا پروگرام تھا؟“

”یہی کہ کیپشن حمید کو اجر جن پورے کے ایک مکان میں لے جاؤ۔ اس کے علاوہ اور پچھے نہیں جانتی۔ میرے بیک میں دو طرح کے چالکلیٹ تھے۔ میں نے غلطی سے وہ پیکٹ نکال لیا جو بعد کے استعمال کے لئے تھا۔ اسکیم یہ تھی کہ میں کیپشن کو ساتھ لے کر باہر آؤں گی اور وہاں ایک ٹیکسی پہلے سے موجود ہو گی۔ جسے ہمارا ہمیشہ کرتا ہو گا۔ پھر ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے بعد میں کیپشن کو خواب آور چالکلیٹ پیش کرتی تھیں لیکن کھیل گز گیا۔ کیپشن کی طرح بھی اپنی موڑ سائیکل وہاں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ موڑ سائیکل ہی سے ارجمند پورہ چلیں گے۔“

”تم نے فنچ کے متعلق کس وقت اطلاع دی تھی اور اطلاع دینے کا طریقہ کیا تھا؟“

”اس کے لئے میں نے ٹرانسیمیٹر استعمال کیا تھا کیونکہ ڈریڈ نے چھپلی رات اپنی قیام گاہ تبدیل کر دی تھی۔“

”چھپلی رات وہ کہاں تھا؟“

”لڑکی نے اسی عمارت کا پہاڑ بتایا جہاں سے آج ایک لاش برآمد ہوئی تھی۔“

”موجودہ قیام گاہ کہاں ہے۔“

”اگر یہ معلوم ہوتا تو میں ٹرانسیمیٹر کیوں استعمال کرتی۔“

”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”یہاں سے چلے جانے کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہو سکے۔“

فریدی نے حمید سے کہا۔ ”اسے تیری منزل کے کسی کمرے میں پہنچا دو۔“

حمد اسے ساتھ لے کر چلا گیا اور تقریباً بیس منٹ بعد پھر واپس آگیا۔

”میں دس منٹ بعد سر جاؤں گا۔“ وہ کلائی کی گھری دیکھتا ہوا بولा۔

”کیوں...؟“

”ہارٹ فلیٹ ہو جائے گا۔“ حمید نے لاپرواپی سے کہا۔ ”آپ یہ تو بتانے سے رہے کہ ہاہ

”بھجوادنے کی دھمکی اتنی کارگر کیوں ہوئی تھی۔“

”بہت معمولی سی بات ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”امریکہ کی مختلف ریاستوں کی پولیس نے ڈریڈ کو انسی کے آدمیوں کے ذریعہ پکونے کی کوشش کی ہے۔ لہذا اس کا جو ساتھی بھی پولیس

کے ہاتھوں میں پڑنے کے باوجود بھی کبھی آزاد دیکھا گیا مردہ ہی دیکھا گیا۔ ڈریڈ کا یہ اصول ہے کہ

”کسی ایسے ساتھی کا وجود برداشت نہیں کر سکتا ہے پولیس سزا دیے بغیر چھوڑ دے۔“

”پھر اب ہم اس لڑکی کا حلوبہ بنائیں گے یا اچار ڈالیں گے؟“

”آن ٹھوڑا... ذرا اسپر گک کا مجھ تک ہو آئیں۔“

”اور اگر وہ بھاگ گئی تو...؟“

”واپسی پر تم اس کا حشر دیکھی ہی لو گے۔“

اسپر گک کا مجھ کے چھوٹے سے چھانک میں دو آدمی داخل ہوئے۔ سارے پائیں بااغ دن کی طرح

روشن تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے آدمی نے ان دونوں کو کپاٹوٹ میں داخل ہوتے دیکھا اور

تیری سے ان کی طرف بڑھا لیکن وہ برآمدے کی طرف جانے والی روشن کی بجائے بائیں جانب مڑ

کر چار دیواری سے لگ گئے تھے۔ انہیں ایسا کرتے دیکھ کر اس آدمی نے جیب سے جیوں اور نکال لیا

اور جھک کر چلے رہا۔ چار دیواری سے تقریباً تین چار فٹ ہٹ کر ڈڈو نیا کی باڑھ کا سلسہ تھا۔ یہ

آدمی باڑھ کے پیچھے آچھا۔ اس کی نظر ان دونوں پر تھی جو دیوار کے قریب بھکے کھڑے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی نارچ کی روشنی میں دیوار پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ دفتہ اس نے

”دوسرے سے کہا۔“ راستہ مل گیا۔“

”کہاں؟“ دوسرے نے پر اشتیاق لجھے میں پوچھا۔

”یہ رہا...!“ اس نے انگلی سے دیوار کے ایک سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔

”آہا.... تو چلو....!“

”نہیں پہلے تم....!“

”واہ بھی.... پہلے تم....!“

”بیکار بجھ کر کے وقت بر بادنہ کرو.... چلو....!“

”میں تو پہلے ہرگز نہیں جاؤں گا جس نے راستہ دریافت کیا ہے پہلے وہی قدم رکھے۔“

بازہ کے پیچھے چھا ہوا آدمی جرت سے انہیں دیکھا رہا۔

”تم چلتے ہو کر میں دوسرا طریقہ اختیار کروں۔“

”کیا طریقہ اختیار کرو گے۔ میں بھی تو دیکھوں۔“ دوسرا کو شاید غصہ آگیا تھا پھر ہوئے آدمی نے جرت سے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں ریو الور تھے اور دونوں کی نالیں ایک دوسرے کے طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”تمہاری یہ جرأت۔“ ایک بولا۔

”ہاں! کیا میں تم سے کمزور ہوں۔“ دوسرا نے کہا اور بیک وقت دونوں کے ریو الوروں سے شعلے لٹکے۔ بازہ کے پیچھے چھا ہوا آدمی اچھل کر عادت کی طرف بھاگا۔ وہ درانہ اندر گھستا چلا گیا اور پھر اگر سنبھل نہ گیا ہوتا تو اس چھوٹے سے آدمی سے ٹکرنا جانا لازمی تھا جو خود بھی ترقیا دوڑتا ہوا صدر دروازے کی طرف آ رہا تھا۔

”اوہ... معاف سمجھنے کا جتاب۔“ وہ آدمی گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

”کیا بات ہے؟“ چھوٹے آدمی نے اُسے گھوڑتے ہوئے پوچھا۔ اُس نے ہانپتے ہوئے جلدی جلدی پورا اواقعہ دھرا دیا۔

”خطرہ...!“ چھوٹا آدمی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”دیکھو! باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ دروازے بند کر دو۔ ہو سکتا ہے یہ جال پولیس ہی نے پھجا یا ہو۔“

”مگر جناب! انہوں نے ایک دوسرے پر گولیاں چلانی تھیں اور ڈھیر ہو گئے تھے۔“

”تم نے انہیں صرف گرتے دیکھا ہو گا۔ ضروری نہیں کہ ریو الور اصلی ہی رہے ہوں چلو۔“ خاموشی سے بیٹھو۔ میں جا رہا ہوں۔ پولیس تم لوگوں کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں پہنچا سکتی۔“ نخا آدمی کھڑکی سے دوسرا طرف صحن میں کوڈ گیا۔ کپاؤٹ سے پھر فائز کی آواز آئی اور ”آدمی جہاں تھا چاپ چاپ دیں کھڑا رہ۔ پھر وہ صدر دروازے کی طرف دوڑا اور اُسے بند کرنے کے بعد کھڑکیاں بھی بند کرنے لگا۔ دو تین فائز اور کچھ چیزیں پھر سنائی دیں۔“

”مارت میں اس کے علاوہ چار آدمی اور بھی تھے اور یہ بھی غیر ملکی ہی تھے۔“

”کیا تصدھے؟“ ایک نے اُسے پوچھا۔

”وہ اُسے بتانے لگ۔ دو فائز پھر ہوئے اور اُس نے اُس کے متعلق نہیں آدمی کی رائے ظاہر کی۔“ ”مگر پولیس کیوں؟“ دوسرا آدمی بولا۔ ”آخر سے اس قسم کا ذرا سامہ کھینے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ وہ لازمی طور پر ذریثہ ہی کے آدمی ہوں گے۔“

ایک گولی آکر کھڑکی کے شیشے سے لگی اور وہ چکنا چور ہو گیا۔

”سنوا!“ وہ آدمی دوسرے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”وہ لوگ شہری علاقے میں اتنی دیر تک گولیاں نہیں چلا سکتے۔ یہ پولیس ہی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا یہاں ہمارے پاس جو اسلحہ ہے اُس سے تو پچھا مختصر اتنا ہی چاہئے۔“

وہ سب ایک بڑے کمرے میں آئے۔ اپنے ریو الور نکال کر میز پر رکھے اور ایک آدمی انہیں سمیت کر رہا میں باندھنے لگا۔ فائزوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں اور پھر ساتھ ہی کسی نے صدر دروازہ پیٹھا شروع کر دیا۔

”جلدی کرو۔“ ایک آدمی بولا اور ریو الوروں کا روہاں اٹھاتا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔ دروازہ برابر پیٹھا جا رہا تھا۔

اُس آدمی نے صحن میں کھڑے ہو کر ریو الوروں کو دوسرا طرف پھیک دیا۔ اس سے پہلے اُس نے عقیقی دروازے سے جھانک کر اطمینان کر لیا تھا۔ دوسرا طرف ساتھا تھا۔ اس عمارت کی پشت پر آپادی نہیں تھی بلکہ دور تک کھیتوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ شاید اسی بنا پر اس عمارت کا نام اسپرینگ کاٹ تھا۔

وہ پھر اسی کمرے میں واپس آگیا۔ صدر دروازہ اب بھی پیٹھا جا رہا تھا۔

”لیکن دوست...!“ ایک آدمی نے نہ راستہ بنا کر کہا۔ ”اگر وہ پولیس نہ ہوئی تو ہم کیا کریں گے؟ ریو اور بھی تم نے پھیکوادیئے۔“

”دروازہ کھولو!“ باہر سے ایک گرج دار آواز آئی۔ ”ورستہ دروازہ توڑ دیا جائے گا۔“

وہ پانچوں بہت احتیاط سے صدر دروازے کی طرف بڑھے اور ایک نے بھاری آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”پولیس... دروازہ کھولو۔“ باہر سے آواز آئی۔

”ہم کیسے یقین کر لیں جبکہ باہر ڈاکو موجود ہیں۔ انہوں نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی۔“ ”تم دوسرا طرف سے بھی نہیں نکل سکو گے۔“ باہر سے آواز آئی۔ مکان کا محاصرہ کیا جا چکا ہے۔“

”بڑی مصیبت ہے۔“ وہ آدمی بلند آواز میں بڑھا۔ ”اس دلیں میں آکر جان سلامت لے جانا مشکل ہے۔“

”ہم دروازہ توڑ رہے ہیں۔“ باہر سے آواز آئی اور ساتھ ہی دروازہ اس طرح ہلایا جانے لگا۔

کوہا تھک لگنا بھی مشکل ہو گا۔ کیوں! کیا خیال ہے؟“

”ہم بالکل نہیں سمجھے جناب۔“

”باہر دولاشیں ہیں۔“

”میں اُنکے متعلق آپ کو کچھ بتاسکوں گا مگر شاید آپ کو یقین نہ آئے۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”یہ میں بعد کو سوچوں گا کہ یقین آنا چاہئے یا نہ آنا چاہئے۔“

اُس نے جو کچھ بھی دیکھا تھا بتایا اور کیپٹن حید بے ساختہ فس پڑا۔ مگر فریدی کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

”کیا فتح اُس وقت یہاں موجود تھا؟“ فریدی نے سوال کیا اور وہ آدمی جو حید کے قبھے پر نزدیک رکھا تھا وہ میں کہہ گیا۔ ”جی ہاں۔“

لیکن پھر سنجنے میں بھی دیر نہیں لگائی اور جلدی سے بولا۔ ”کیا پوچھا تھا آپ نے؟“

”کچھ نہیں۔ اب صرف تم یہ بتا دو کہ فتح یہاں سے کہاں گیا ہوا؟“

”جناب والا۔ میں آپ سے استعمال کروں گا کہ اس نام کے متعلق ہمیں کچھ اور بھی بتائیے۔“

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کس کے متعلق پوچھ گئے کر رہے ہیں۔

”ان چاروں کو حرast میں لے لو۔“ فریدی نے حید سے کہا۔ ”ان کے پاس یقینی طور پر پاپورٹ ہوں گے۔ لیکن چونکہ کپاؤڈ میں دولاشیں پڑی ہوئی ہیں اس لئے ہم نہیں اُس وقت تک حرast میں رکھ سکتے ہیں جب تک کہ ان لاشوں کے متعلق تفہیش جاری رہے گی۔“

”یہ راسرا ظلم ہو گا جناب۔“

”کیوں؟ کیا تمہارے ملک میں مشتبہ آدمی بخش دیئے جاتے ہیں۔“ فریدی نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی اور اسی وقت اپنے ہاتھوں سے اس مکان کو مغلول کر کے چپ چاپ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ گے۔ یہاں دو قتل ہوئے ہیں اور تم نے اختلاف بیانوں سے کام لیا ہے۔“

”ہم نے اختلاف بیانی سے کام نہیں لیا۔“

”پہلے تم کہہ رہے تھے کہ یہاں ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اور اس کے بعد ایک ناقابل یقین داستان دھرا دی۔“

”آپ یقین کیجئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جیسے ہی وہ گرے میں اندر بھاگ آیا۔“

پھر متعدد فائزوں کی آوازیں آئیں اور ہم نے دروازہ بند کر لیا۔

فریدی چند لمحے انہیں گھورتا رہا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”کچھ بھی ہو میں تمہیں چھوڑ سکتا۔“

جیسے سچ مجھ توڑا جائے گا۔

”ٹھہر وہم کھولتے ہیں۔“ ایک آدمی کہہ کر آگے بڑھا۔

”نہیں ٹھہر جاؤ۔“ دوسرا بولا۔ ”انہیں دروازہ توڑنے دو۔ اگر یہ وہی ڈاکو ہوئے تو کیا ہو گا؟“ جنہوں نے ہمیں خوفزدہ کرنے کے لئے فائز کے تھے۔

”یہاں دولاشیں بھی ہیں جن کے لئے تمہیں جواب دہونا پڑے گا۔“ باہر سے آواز آئی۔

”ہمیں کسی لاش کا علم نہیں۔ وہ ہمارے آدمیوں میں سے بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم سب اندر موجود ہیں۔“

دروازے پر ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ یہ پانچوں خاموش کھڑے رہے۔ جس آدمی نے دروازہ کھولنا چاہا تھا بہت زیادہ زروں نظر آ رہا تھا۔ آخر کار دروازہ توڑت ہی گیا اور وہ پانچوں اچھل کر بھاگے۔

”خُردار... ٹھہر وہر...“ ورنہ ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ ”کتنی فریدی نے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوں اور تھا۔ وہ رک گئے۔

”اپنے ہاتھ اٹھا لو۔“ فریدی نے سخت لہجے میں کہا اور انہوں نے خاموشی سے تعجب کی۔ اُس کے ساتھ کیپٹن حید کے علاوہ تین آدمی اور بھی تھے۔

”تم یہیں ٹھہر وہ۔“ اُس نے اُن سے کہا اور اندر گھستا چلا گیا۔

”آخر ہم لٹھتی ہی گئے۔“ ایک آدمی کپکپائی ہوئی آواز میں بولا۔

حید نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”فتح کہاں ہے دوستو؟“

”کیا فتح؟“ اُس نے حیرت سے کہا۔ ”ہم کسی فتح کو نہیں جانتے۔“

”اچھی بات ہے۔ چپ چاپ کھڑے رہو۔“ حید بولا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ان کی جامہ تلاشی لو۔“

”ہم نہیں سمجھ سکتے جناب کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔“ ایک آدمی بولا۔ ”ہم پر ہی ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔ ہمیں ہی پولیس پر بیان کر رہی ہے۔“

”چپ چاپ کھڑے رہو۔“ حید نے اُسے دانتا۔

پھر دیر بعد فریدی واپس آگیا۔

”فتح نکل گیا۔“ اُس نے پانچوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ”تم شریف آدمیوں

فریدی کی نظر اس پر پڑی تھی۔ مگر تھیک اسی وقت فتح نے آبادی کے بیچے والی جہازیوں میں چلا گا لگائی۔ یہ دونوں بھی اپنی پوری قوت سے دوزرا ہے تھے۔
جہازیوں میں گھے تو فتح کھائی کے اس پار نظر آیا۔
”ٹھہر جاؤ۔“ فریدی حید کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

حید رک گیا۔ لیکن اسے فریدی کی اس حرکت پر تعجب ضرور ہوا۔ اور پھر جب نظر اٹھائی تو اس پر جیرتوں کے پہاڑوں پر کوئی نہ فتح بھی رک گیا تھا۔ اور پر کھائی کے اس پار تاروں کی چھاؤں میں وہ صاف نظر آ رہا تھا۔
حید نے جیب سے روپا اور نکالا لیکن فریدی اُسکے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا آہستہ سے بولا۔ ”نہیں۔“

”میں اسے لے گئے جا رہا تھا۔“ حید جلا گیا۔ ”آپ خواہ توہا پر بیان ہو گئے۔“

”بہت دلیر ہے حید صاحب۔ بہت دلیر۔ میں اسے چھپ کر مارنا پسند نہیں کر دیں گا۔“
”نہیں آپ اسے کاک میل پارٹی دیتے ہیں۔ میرے باواکا کیا جاتا ہے۔“

”ارے آڈن۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں نے بہت دلوں سے دوڑ نہیں لگائی۔
اچ موقع ملا ہے تو تم لوگ ڈھیلے پڑ رہے ہو۔“

”درستئے۔ وہ پھر کی اولاد چلتی کر رہا ہے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔ حید اور زیادہ جھلا کر بولا۔ ”اگر آپ محکمہ سراج رسانی میں نہ ہوتے تو آپ سے صرف کسی پاکل خانے ہی میں ملاقات ہو سکتی۔“

”تم تھیک کہتے ہو۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔
فتح جہاں پہلے تھا وہیں اب بھی کھڑا تھا۔

”ہائیں یہ کیا؟“ دھھاتا حید کے منہ سے بے اختیارانہ طور پر نکلا۔ نہ جانے کہ ہر سے نکل کر تین چار آدمیوں نے فتح پر حملہ کر دیا تھا۔

”کیا یہ آپ کے آدمی ہیں؟“ حید نے فریدی کا بازو پکڑ کر کہا۔

”نہیں.... اوہ....!“ فریدی نے مھضربانہ انداز میں کہا اور روپا اور نکال کر فائز کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے ہاتھ رک گئے ہوں لیکن پھر وہ کھیتوں میں کو دیکھتے۔ کھیت نشیب میں تھے لہذا اب وہ انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

دھھاتا نہیوں نے یہے بعد دیگرے تین چھینیں سیں اور فریدی کھائی میں اتر گیا۔ حید نے بھی اس کا ساتھ دینا چاہا لیکن جہازیوں میں الجھ کر منہ کے بل بیچے چلا گیا۔ پھر حقیقی دیش وہاں

تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمارت کو مغلول کرانے کے بعد انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس کا ایک آدمی وہیں رک گیا تھا کیونکہ دونوں لاشیں ابھی وہیں پڑی ہوئی تھیں۔
وہ انہیں قریبی تھا نے بھجو اکر اسپر مگ کاٹھ میں واپس آگیا۔

”آخراب ڈریڈ کے ساتھیوں پر کیوں اتنے مہربان ہیں؟“ حید نے پوچھا۔ ”آپ اس کے آدمیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن فتح کے آدمی آپ سے نہ چھوڑے گے۔ حالانکہ اب مجھے بھی اس چھرخ سے ہمدردی ہو گئی ہے اور آپ بھی اس کیلئے ہمدردی ہی کا جذبہ رکھتے ہوں گے۔“
فریدی پچھنے بولا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”میں ڈریڈ کے صرف ان آدمیوں کو نظر انداز کرتا ہوں جن کے متعلق مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ اُسکے بارے میں پچھنے جانے ہوں گے۔“
”اور اس وقت تو وہ صاف نکل گئے۔“

”ہاں.... آں....!“

”بُل دھوکا کھا گیا۔ اندر سے دو فائزوں کی آوازیں آئیں اور میں سمجھا شاید کھیل شروع ہو گیا ہے۔ اگر کچھ دیر اور خاموش رہتا تو ان میں سے ایک بھی نکل کر نہیں جا سکتا تھا۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ فتح کے آدمی اُس کی قیام گھٹھے واقف ہیں؟“

”فتح پچھے دیر پہلے بیہیں تھا اور وہ بچھلی دیوار سے کوکر فرار ہوا تھا۔ دوسری طرف زم زمین پر اس کے پیروں کے نشانات دیکھنے کے بعد میں نیتیجے پر پہنچا ہوں۔“

”یہ دونوں کم بخت بہت دلوں سے دردسر بنے ہوئے ہیں۔“ حید بڑا بڑا۔

لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے میں فریدی کو اچھلتے و کھلا۔ اس نے ڈڈنیا کی بائڑ کی دوسری طرف چلا گا لگائی تھی۔ حید بھی بے اختیارانہ انداز میں اسی طرف جھپٹا لیکن پھر اچانک اسے ایسا معلوم ہوا چیزے زمین نے اس کے پیروں کی پکڑ لئے ہوں۔ کیونکہ اس نے ایک ننھے سے آدمی کو اچھل کر دیوار پر چڑھتے دیکھا تھا۔ اگر وہاں اندھیرا ہوتا تو وہ اُسے کوئی بندر ہی سمجھتا۔

نیلا بیگ

حید کو اس کی توقع نہیں تھی کہ چھانک تک پہنچنے میں جو وقت صرف ہوا اس کے بعد انہیں فتح کا سایہ بھی مل سکے لیکن شاید فتح ہی اس معاملے میں چوک گیا تھا۔ کیونکہ چھانک سے نکلنے

ظاہر ہے جو کچھ بھی ہوتا۔

”یہ فتح حق تاذکرہ ذریعہ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ میرے اندازے آج تک غلط نہیں ہوئے۔“
حید کو گویا ساتھ سوچنے لگا تھا۔

”بیکار ہے۔“ فریدی سرہلا کر بولا۔ ”اب ہم اسکی گرد کو بھی نہ پاسکیں گے۔ پہلے بھی اگر وہ چاہتا تو فرار ہو سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ اسپرینگ کاٹھ میں واپس آگئا تھا۔ آہا شہرو... کیا وہ وہاں سے اپنی کوئی خاص چیز لے جانا بھول گیا تھا۔ آؤ جلدی کرو۔ آخر وہ واپس کیوں آیا تھا اور شاید یہاں اس وقت چلتی کرنے کا مقصد بھی بھی تھا کہ وہ ہمیں جھکایاں دے کر پھر اسپرینگ کاٹھ میں جا گھے۔“
انہوں نے بڑی تیری سے کھائی پار کی اور اسپرینگ کاٹھ کی طرف چل پڑے۔ حید کے ذہن پر اتنی ہی سی دیر میں اچھی خاصی برف باری ہو گئی تھی اور اس نے اب کچھ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔
وہ کرتا بھی کیا۔ حالات بڑی تیر قفاری سے رخبدل رہے تھے۔
وہ پھر اسپرینگ کاٹھ میں واپس آئے۔ ان کے مجھے کاہدہ آدمی ڈیں موجود تھا جہاں وہ اُسے چھوڑ کر گئے تھے۔

”اوھر کوئی آیا تو نہیں؟“ فریدی نے اُس سے پوچھا۔
”نہیں جتاب!“ اُس نے جواب دیا۔

”آؤ....!“ فریدی حید سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا لیکن پھر رکا اور مڑ کر اُس آدمی سے بولا۔ ”کسی کو بھی کمپاؤڈ میں قدم مت رکھنے دین۔ خواہ وہ کوئی سرکاری آدمی ہو خواہ غیر سرکاری۔“
”بہت بہتر.... جتاب....!“ اُس نے کہا اور چاک کی طرف بڑھ گیا۔
”مگر دروازہ تو آپ مقفل کراچکے ہیں۔“ حید بڑھ لیا۔
”فکر مت کرو۔ اسی لئے میں نے اُسے یہ ہدایت دی ہے۔ قفل کو لوٹا پڑے گا۔“
برآمدے میں چلتی کر فریدی نے وہاں کی روشنی بجھا دی۔

حید جانتا تھا کہ اُسے قفل کھولنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کیونکہ اس قسم کے اوزار ہر وقت اُس کی جیب میں پڑے رہا کرتے تھے۔
وہ منٹ کے اندر ہی اندر وہ عمارت میں تھے۔



ذکر ذریعہ کسی زخمی بھیزیری کی طرح غارہ تھا اور کر گیک اُس کے سامنے کھڑا اس طرح

فریدی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر پھر دوڑا۔ اُسے چوٹیں سہلانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ اپنی دانست میں حرمت انگیز پھرتی کے ساتھ کھائی کے دوسری طرف پہنچا۔
لیکن یہاں اُسے صرف فریدی نظر آیا۔

”پانچ ہوئے۔“ اُس نے کہا۔

”کیا پانچ ہوئے؟“ حید نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”مرنے والے۔“ فریدی کا محضرا ساجوب تھا۔

پھر حید کی نظر ان تین آدمیوں پر پڑی جو زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

”کیا یہ مر گئے؟“ حید نے بوکھلا کر پوچھا۔

”ہاں....!“

”مگر.... اُپ نے شاید ہوائی فائر کیا تھا؟“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ فریدی نے تیخ لجھ میں کہا۔

حید جھک کر لاشوں کو دیکھنے لگا۔ فریدی کہہ رہا تھا۔ ”انہیں خبر سے ہلاک کیا گیا ہے اور یہ اتنے مشاق ہاتھوں کا کرشمہ ہے کہ یہ شاید ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکے۔“ تینوں زخم دل کے مقام پر ہیں۔

”اوڑیہ ہیں کون؟“

”ڈریٹ کے آدمیوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔“

”آف.... فو.... تو یہ فتح تھا۔ لیکن ہر حال میں اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔
آپ نے اُسے نکل جانے دیا۔“

”میں نے نکل جانے دیا؟“ فریدی نے حرمت سے دہر لیا۔

”یقیناً.... نہ آپ دیر لگاتے.... اور نہ....!“

”اور نہ ہم دونوں بھی زندہ رہتے۔“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔ ”ڈریٹ کے آدمی یہاں چھپے ہوئے تھے۔ کیا تم اندر ہیرے سے آئے ہونے تیر کا رخ موز سکتے ہو۔ میں تو کم از کم اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دھوکے سے کچھ گئے جملے سے بھی بیٹھ جاؤں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس وقت مخفی دماغ ٹھٹھدار کھنے کا عادی ہونے کی بجائے پربال بال بن گیا۔“

حید کچھ نہیں بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس موقعے پر تھا ہوتا تو کیا ہوتا۔ شاید اس کا وہی انجام ہوتا جس کی طرف ابھی فریدی نے اشارہ کیا تھا۔ فتح کا چلتی وہ کبھی نہ برداشت کر سکتا اور پھر

کاپ رہا تھا۔
”اب انصاف نہیں ہو سکے گا... ذاکر...!“ اُس نے بالکل اسی طرح کانپتی ہوئی آواز میں کہا جیسے جاڑا دے کر بجارت آگیا ہو۔
”نہیں ہو گا۔“ ذاکر ڈریڈ مسکرا لایا۔ ”تم اپنا ہاتھ تو دیکھو۔ کیا اس ہاتھ سے تم مجھ پر فائز کر سکو گے۔ ویسے میں تمہاری اس دلیری کی دل نے قدر کرتا ہوں۔ ڈریڈ پر ریو اور اخھانا آسان کام نہیں ہے۔ اس دلیری کے عوض میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اور... اس کے عوض...
ذالی بھی تمہیں دی جاتی ہے۔“

کریگ چیرت سے منہ کھو لے ستارہ۔
”میں اپنے بچے کچھ آدمیوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتا ورنہ میں تمہارہ جاؤں گا۔“ ڈریڈ زم لجھ میں بولا۔ ”آئندہ جو کچھ بھی کرو سوچ سمجھ کر کرو۔“

”مم... میں... بہت محتاط رہوں گا ذاکر...!“ کریگ ہکلایا۔
”یقیناً... ورنہ اب کوئی ٹھوکر ہم سب کو غارت کر دے گی۔ خیر ہاں... اب فتح کے لئے ایک ہی تدبیر رہ گئی ہے۔ تم وہ الماری کھول کر اوپری خانے سے وہ ٹیب نکالو جس میں سرخ رنگ کا سیال بھرا ہوا ہے۔“

کریگ نے ریو اور جیب میں رکھ لیا اور بڑے سعادت مندانہ انداز میں الماری کی طرف بڑھا۔ اُس کا ہینڈل پکڑ کر دروازہ کھولا اور اوپری خانے میں ٹیوب ٹلاش کرنے لگا۔
”اوہ... جی ہاں... مل گیا۔“ وہ شیشے کا نیوب لئے ہوئے مژا جس میں سرخ رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔

”ٹھیک... اسے خوب ہلا کر روشی کے رخ دیکھو کہ اس میں سفید ذرات ہیں یا نہیں۔“
وہ اُسے مٹھی میں پکڑ کر ہلانے لگا پھر بلب کی طرف اٹھا کر دیکھنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ ٹیوب ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ پھٹا اور سرخ سیال کی بوچھاڑا اُس کے چہرے پر پڑی۔

”آغ... غاہ...!“ وہ کسی جانور کی طرح جیچ کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔
اُس کے دونوں ہاتھ آنکھوں پر تھے اور وہ نبڑی طرح تڑپ رہا تھا۔

”مار ڈالا... سور... کینے... کتے!“ گالیاں اُس کے منہ سے ابھی ریس اور وہ تڑپا رہا۔ ذاکر ڈریڈ بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ تھی۔ کریگ اس طرح پیختا اور تڑپا رہا۔

کاپ رہا تھا جیسے اُسے دوسرے ہی لمحے سفر آخرت کا خدشہ ہو۔

”میں تم سب کو موت کے گھاٹ اٹا ردوں گا۔“

”ذاکر ڈریڈ... انصاف پسند ہے۔“ کریگ کا نپتا ہوا بولا۔

”ہاں میں پورا پورا انصاف کروں گا۔“

”دیکھتے ذاکر... آج فتح ختم ہی ہو جاتا۔... مگر وہ فریدی آکو دا۔“

”وہ بھی تمہاری ہی وجہ سے آکو دا۔ میں پورا پورا انصاف کروں گا۔“

”میری وجہ سے کیوں ذاکر؟“

”میری سدھکلشن جانتی تھی کہ فتح اسپر گ کائیں ہیں ہے۔“

”لیکن مجھے کیا علم کہ وہ جانتی تھی۔“

”تم نے مجھ سے مشورہ کئے بغیر وہ اسکیم بنائی ہی کیوں تھی میں انصاف پسند ہوں اور پورا پورا انصاف کروں گا۔“

”دفعہ الماری میں رکھے ہوئے فون کی تھنھی بھی اور ذاکر ڈریڈ ادھر متوجہ ہو گیا۔“

”کون ہے؟“ وہ ماڈ تھے پیس میں غریا۔

”سام اسپرینگ ذاکر...!“

”کیا بات ہے؟“

”جس نیلے بیک نے متعلق آپ نے پوچھا تھا وہ صندوق میں موجود نہیں ہے۔“

”میا سکتے ہو... دوبارہ ٹلاش کرو۔“

”آپ سننے تو سہی۔ اُس کی بجائے دفعتی کا ایک ڈبہ ملا ہے جس پر تحریر ہے فتح کی طرف سے ذاکر ڈریڈ کے لئے تھا۔ اور اُس ڈبے میں ایک سڑا ہوا آلہ ہے۔“

”مگر اُس کی رسائی صندوق تک کیسے ہوئی؟“ ڈریڈ دھاڑا۔

”اُس کا جواب کریگ ہی دے سکے گا ذاکر۔ وہ بڑی لاپرواپیاں برٹ رہا ہے اور ہر وقت ذالی کے چکر میں رہتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ دونوں اودھ ہمچاۓ ہوئے تھے۔“

”اوہ... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فتح اس قیام گاہ سے بھی واقف ہے؟“

”اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے... ذاکر...!“

”چھا...!“ ڈریڈ ریسیور کھ کر کریگ کی طرف مڑا لیکن جو کچھ بھی دیکھا کم از کم اُس کے لئے تو غیر متوقع ہی تھا۔ کریگ کے کانپتے ہوئے ہاتھ میں ریو اور تھا اور وہ اب بھی نبڑی طرح

کے مطابق نہیں ہوتا تھا تو اُس کی الاتہست ہمیشہ بڑھ جایا کرتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ فتح اس وقت پکڑ لیا جائے گا مگر اُس کی توقعات کے مطابق وہ خیر کیڑا نہ پکڑا جاسکا۔ اس کے علاوہ چلتے چلاتے اُس کے چیختنے تو اسے ذہنی طور پر بالکل نہ ٹھال کر دیا تھا۔ ایک ساری ٹھیکانے پر چھڑ کر کے نکل جائے۔ حمید کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کم از کم فریدی کو تو گولی مار دے جس نے اس وقت عالمگیر شہرت کو بدلا گایا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ حمید بھی ہیر و پرستی کے معاملے میں عام ذہنی سطح سے بلند نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ اُس کے کسی پسندیدہ ہیر و کی شخصیت میں کسی قسم کی جھوٹ نظر آسکے۔

وہ بے دلی کے ساتھ ادھر اور چلتا رہ آخیر فریدی ہی نے کہا۔ ”تم بہت ست نظر آرہے ہو؟“

”بھی ہاں۔ اس وقت میں نے ایک انہائی دلیر آدمی کی مٹی پلید ہوتے دیکھی ہے۔“

”اوہ فریض... کیا تم مجھے نازن یا ہٹڑ والی کا بینا سمجھتے ہو؟“ فریدی نے ہنس کر کہا۔

”آپ کیلئے یہ بڑی بات نہ ہوگی۔ لیکن میں.... میرا دل چاہ رہا ہے کہ خود کشی کروں۔“

”یہاں نہیں.... پہلے ہی سے پانچ لاٹوں کے اٹھوانے کی فکر ہے۔“ فریدی نے کہا اور اُس کی تاریخ کی باریک سی شاعر انہیں میں ادھر اور ہر ریگتی ری۔

اچانک حمید نے تاریخ اُس کے ہاتھ سے گرتے دیکھی اور دروازے کی طرف چھپتا۔

”روشنی... حمید...!“ اُس نے دروازے کے باہر چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔

حمدید تاریخ اٹھانے کے لئے جھکاہی تھا کہ منہ کے مل نیچے چلا گیا۔ کسی نے اُس کی ٹانگوں میں ٹانگ پھنسا کر دھکا دیا تھا۔

”میں نے دیکھ لیا ہے فتح ہے۔“ فریدی نے کمرے کے باہر سے کہا۔ ”تم کمرے سے نکل نہیں سکتے۔“

حمدید بڑی پھرتی سے اٹھا۔ فتح اُسی کمرے میں موجود تھا لیکن وہ ایک دیوار سے جالا۔ کیونکہ کمرے میں گھپ انہیں تھا۔ تاریخ بھی اُس کے ہاتھ نہیں آسکی تھی۔ اُس نے اپنی تاریخ کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن وہاں نہ تاریخ تھی اور نہ رویا اور۔ شاید اُسی وقت دونوں اُس کی جیب سے نکل گئے تھے جب وہ گرا تھا۔

”فتح خود کو میرے حوالے کر دو۔“ فریدی نے باہر سے کہا۔

”تم دروازے کے پاس سے ہٹ جاؤ دوست۔“ حمید نے فتح کی آواز سنی۔ ”ورنہ تمہیں اپنے ساتھی کی لاش بھی یہاں سے اٹھوائی پڑے گی تم لوگوں سے میرا کوئی جگڑا نہیں ہے۔“

ڈاکٹر ڈریڈ کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کی چمک لہریں لے رہی تھی جیسے وہ اُس کا مرغوب ترین کھیل ہو۔ کریگ کی آواز مضھل ہوتی گئی اور آخر کار اُس کی گردن جھنکلے کے ساتھ ایک طرف چاہ پڑی۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اُس کی دلوں آنکھیں بہہ گئی تھیں۔

”ڈریڈ کا انصاف۔“ ڈاکٹر ہونوں ہی ہونوں میں بڑا ہاتا ہوا فون کی طرف مڑ گیا۔

”بیلو... سام...!“ وہ ماڑ جھ پیس میں کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں یہ عمارت اسی وقت خالی کر دینی چاہئے۔ نمبر تین میں چلو۔ نیلا بیک اگر نہ ملا تو سمجھو ساری محنت بر باد ہو گئی۔ اب فتح کو ہر قیمت پر مرجانا چاہئے۔ وہ اس قیام گاہ سے بھی واتف ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس کی رہبری کے فرائض انجام دے ڈالے اور میں اُس وقت تک پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا جب تک بیگم ارشاد والا مسلکہ نہ طے ہو جائے۔“ تمہیں ڈالی پسند ہے نا...؟“

”نن... نہیں... نج... جتاب...!“ دوسری طرف سے ہکلاہٹ سنائی دی۔

”نہیں وہ تمہیں پسند ہے۔ وہ تمہیں بطور انعام دی جاتی ہے۔“

”اوہ... ڈاکٹر... میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ مگر کریگ میرا دشمن ہو جائے گا۔“

”کریگ...!“ وہ مزر کر لاش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ کریگ اب اس دنیا میں نہیں۔ نائیں تھری کا نیوب شٹ کرتے وقت اُس کی موت واقع ہو گئی۔ نیوب پھٹ کیا... خیر... ہاں تو... نمبر تین میں شفت کرنے کی تیاری کرو۔“

”بہت... بہت... اچھا... جتاب!“ دوسری طرف سے پھنسی پھنسی سی آواز آئی اور ڈاکٹر ڈریڈ نے رسیور کھ دیا۔



فریدی اور حمید نے اپر گرگ کالج کی علاشی لینی شروع کر دی تھی۔ لیکن یہ کام بہت احتیاط سے ہو رہا تھا۔ انہوں نے کروں میں روشنی نہیں کی تھی بلکہ تارچوں کی مدھم سی روشنی میں دیکھ بھال کر رہے تھے۔

حمدید کا دل اس کام میں ذرہ برابر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اگر فریدی ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ بھاگ ہی نکلنے میں عافیت سمجھتا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ذرپوک تھا۔ اُسے اُس کی پرواہ نہیں تھی کہ انہیں میں کسی کی گولی اُس کا مغز بھی چھڑا سکتی ہے۔

وہ تو اکتیا ہوا تھا۔ یہ چیز اُس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اگر کوئی کام اُس کی مر منی یا توقع

حمد آہستہ آہستہ آواز کی طرف رینگنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اُس نے فریدی کی آواز سنی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ گرتے گرتے سنبھل گیا ہو۔
”فتح میں گولی مار دوں گا... تھہرو۔“

پھر دوڑنے کی آواز آئی اور حمید بڑی تیزی سے باہر نکلا۔ عمارت کا عقبی دروازہ جو صحن کی ایک دیوار میں تھا کھلا ہوا ملا۔ حمید نے فریدی کو آوازیں دیں لیکن جواب نہارہ۔ آخر وہ دروازے سے کے پاس ہی رک گیا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے کہ فریدی اُسی دروازے سے اندواخ ہوا۔ یہاں بھی اندر ہرا تھا لیکن تاروں کی چھاؤں میں وہ کم از کم فریدی کو تو پہچان ہی سکتا تھا۔

”دیکھو... برآمدے میں سوچ بورڈ ہے... روشنی کر دو... وہ کم جنت میری نالگوں کے نیچے سے نکل گیا۔“

حمد نے بلد ہی سوچ بورڈ تلاش کر لیا اور صحن میں روشنی پھیل گئی۔ اُس نے فریدی کو جبکہ کرچھ اٹھاتے دیکھا۔ وہ بھی اُسکے قریب پہنچ گیا۔ یہ ہلے رنگ کے چھڑے کا ایک چھوٹا سا یک تھا۔ ”وہ نہیں لے جا رہا تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن دیوار پر چڑھتے وقت یہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ خدا کی قسم وہ بڑا پھر تیڑا ہے۔ بندروں سے بھی تیز۔ پہلے اُس نے میرے ہاتھ پر پھر مار کر ثارچ گردی اور پھر اُسی کمرے سے یہ بیک لے جا گا کہ کون؟ اس بار تو موقع ہی موقع تھا لیکن تم نے اُسے پکڑا کیوں نہیں؟“

حمد کچھ نہ بولا۔ اور فریدی نے ہنس کر کہا۔ ”کیا پہلے بھی کبھی کوئی ایسا مجرم نظر دیں سے گذر آہے۔ بخدا مجھے تو بعض اوقات اس کی ان حرکتوں پر پیدا آتا ہے... کتابے جگر ہے۔“

نخا فتنہ

بیگم ارشاد نے کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے اور شب خوابی کا باباں پہن کر مسہری کی طرف بڑھی لیکن پھر اُسے رک جانا پڑا کیونکہ ایک گوشے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجئے گئی تھی۔
”ہیلو...!“ اُس نے جاہاں لیتے ہوئے کہا۔
”کون ہے؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”بیگم ارشاد...!“

”اچھا... انور بول رہا ہوں بیگم ارشاد۔“

”کیا بات ہے؟“ بیگم ارشاد نے غیر متوقع طور پر زم لجھ میں پوچھا۔

”میں وہ دو ہزار روپے والیں کرنا چاہتا ہوں جو شاہینہ نے مجھے دیے تھے۔“

”مجھے روپوں سے کوئی سرداڑا نہیں۔“

”ظاہر ہے کہ جب میں شاہینہ کے لئے کام نہیں کر رہا ہوں...!“

”کیوں نہیں کر رہے ہو؟“ بیگم ارشاد نے بات کاٹ دی۔

”نہیں! میں نہیں چاہتا کہ ان پر پاگل پن کے دورے پڑتے رہیں۔“

”تمہارا بودل چاہے کرتے رہو۔ لیکن کوئی کھڑک رخ کرنا اور شاہینہ سے بھی مت ملو۔“

”پھر میں کیا کر سکوں گا بیگم ارشاد۔ مجھے واقعات کا بھی تو علم نہیں ہے۔“

”میں تمہیں دس ہزار کا آفریدی تھی ہوں۔ ایک آدمی کو تلاش کرنا ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“

”مگر پولیس کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔“

”کس بات کا علم؟“

”بھی کہ تم اُس آدمی کی تلاش میں ہو۔“

”ہو سکتا ہے بشرطیکہ اُس دس ہزار میں اُس کا قتل بھی شامل نہ ہو۔“

”نہیں یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس کے لئے قتل ضروری ہو۔“

”اُس کی تلاش کیوں ضروری ہے؟“

”دس ہزار روپے کا آفراں نہ نہیں ہے کہ تمہیں غرض و غایت بھی بتائی جائے۔“

”اچھی بات ہے۔ میں غرض و غایت سے کوئی سرداڑا نہیں رکھوں گا۔ آپ اُس آدمی کے نام و نشان سے تم مطلع کیجئے۔“

”نام... مجھے یاد نہیں لیکن اُس کے دابنے ہاتھ پر روپے کے برابر ایک گہر اسرائیل شان

ہے۔ تم اُسے اب جن پورہ یا شہر کی دوسری بستیوں میں تلاش کر سکتے ہو۔“

”بس اتنا ہی... یا اور کچھ؟“

”اُس کے متعلق بس اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔“

”تھی تو دس ہزار بہت کم ہیں۔ بیگم ارشاد مجھے کم از کم تیرہ لاکھ آدمیوں کی آشیانی اللہ

”دو کروڑ...!“

”اُسکی چو تھائی مجھے قارون بنا سکتی ہے۔ کاش میں بھی کسی معاملے میں آپکو بلیک میل کر سکتے۔“

”آپ بلیک میل سے مل جاؤ۔“ بیگم ارشاد نے خخت لجھ میں کہا۔

انور ہنسا اور پھر بولا۔ ”لیکن دعوت والی رات آپ نے یقیناً اسے دیکھا ہو گا؟“

”حالات سے بیکی ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے اسے دیکھا ہو گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اسے

نہیں دیکھ سکی۔ اس کا ایک خط مجھے ملا تھا اور اُسی کے ساتھ وہ سوئی بھی تھی۔ مجھے مجبور اُوہی کرنا

پڑا جو کچھ خط میں تحریر تھا۔ اگر ایسا نہ کرتی تو اور نہ جانے کس بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اُس وقت

اگر وہ تمہیں قتل کرنے کو بھی کہتا تو میں انکار نہ کر سکتی۔“

”شکر یہ۔“

”تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔“

”لیکن یہ آپ نہ بتائیں گی کہ وہ کس سلسلے میں آپ کو بلیک میل کر رہا ہے؟“

”نہیں۔“ بیگم ارشاد نے خخت لجھ میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔



یہ ایک بڑی عمارت تھی اور اس کے چاروں طرف مختلف چھلوں کے باعث تھے۔ عمارت گوقدہم طرز کا نمونہ تھی مگر پھر بھی تھی شاندار۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا کمین مغربی بلکہ کا باشندہ ہو گا اور ڈاکٹر فرید کے متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ پرانے طرزِ معاشرت کا دلدارہ ایک مشرقی آدمی نہیں ہے۔ اُس کے چہرے پر گھنی سیاہ ڈاڑھی تھی اور جسم پر لباس بادھا۔ کبھی کبھی وہ عقال اور ہندیل استعمال کرتا تھا اور اس بڑی عمارت کے زیر سایہ رہنے والے ”چھوٹے“ آدمی اُسے کوئی عرب سمجھتے تھے۔

اُس کے ساتھیوں کی وضع قطع بھی عربوں ہی کی سی تھی اور اس کی محبوبائیں پر دے میں رہتی تھیں۔ یہ عمارت ایک جاگیر دار سے کرائے پر حاصل کی گئی تھی۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ڈاکٹر کو یہ سب کچھ فتح کی وجہ سے کرنا پڑا تھا۔ رہا پولیس کا معاملہ تو وہ دنیا بھر کی پولیس کو اپنا کھلونا سمجھتا تھا۔ حالانکہ فریدی کے ہاتھوں اُسے دوبار شکست ہو چکی تھی لیکن وہ اس سے اتنا زیادہ خائف نہیں تھا۔

و، فتح کو حقیر بھی سمجھتا تھا اور اُس سے خائف بھی تھا۔ اُس وقت بھی اُسی کے متعلق خیالات

پڑیں گے۔ دو آنے فی کس تو دیجھے تاکہ میں بھی انکم بلیکس ادا کرنے کے قابل ہو سکوں۔“

”کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“ بیگم ارشاد بگر گئی۔

”نہیں۔“ بیگم صاحبہ۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ آپ بھی تو تاتی راتوں سے بھکتی پھر رہی ہیں پھر کیا اُس کا سراغ مل سکا؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ مشکل کام ہے لیکن میں دس ہزار سے زیادہ کے آفر کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”میں آپ کا یہ کام مفت بھی کر سکتا ہوں مگر نہ ہے کیوں نہ میں اُس بلیک میل ہی کی گردان لوں۔“

”بلیک میل...!“ بیگم ارشاد نے حیرت سے دھر لیا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو؟“

”نہیں.... لیکن اگر کوشش کروں تو یہ میرے لئے کوئی مشکل بات نہ ہو گی۔“

”تم نے کرٹل فریدی سے بھی ان باتوں کا تذکرہ کیا تھا؟“

”نہیں.... لیکن آپ کے خلاف ایک رپورٹ ضرور لکھوائی تھی۔“

”کرٹل فریدی اُس کے لئے یہاں پوچھ چکھ کرنے آیا تھا۔ کیا تم نے یہ بھی لکھوایا تھا کہ کوئی مجھے بلیک میل کر رہا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔ یہ تو میرا کیس تھا۔ اس کا تذکرہ میں کیسے کر سکتا تھا۔ شاید نے اُسی بلیک میل کا پتہ لگانے کے لئے مجھے دو ہزار دینے تھے۔ رپورٹ تو میں نے اس لئے لکھوائی تھی کہ آپ میرے خلاف کوئی قانونی کاروائی نہ کر سکیں۔“

”خیر اس پر خاک ڈالو۔ اب میں تم سے کہتی ہوں کہ اگر اُس بلیک میل کا پتہ لگا سکو تو اس کے لئے تیس ہزار کا آفر ہے۔“

”آپ اب سے نہیں جانتیں؟“

”نہیں اب تک میں نے صرف اُس کی آواز سنی ہے۔“

”اوہ وہ لجھ سے کوئی غیر ملکی معلوم ہوتا ہے۔“

”اوہ.... اُس کے متعلق تم مجھ سے کم نہیں جانتے۔“ بیگم ارشاد نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”لیکن انور.... تم اُس وقت تک کوئی میں قدم نہیں رکھو گے جب تک کہ وہ بلیک میل تمہارے ہاتھ نہ آجائے۔“

”وہ آپ سے کتنی رقم طلب کر رہا ہے؟“

میں الجھاہو باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اگر اسے فتح کی موجودہ جائے رہائش کا علم ہوتا تو اسے فاکرا دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا۔ اور وہ لیٹی کی طرف سے بھی مطمئن نہیں تھا کہ فتح کو اس کی موجودہ جائے قیام کا علم نہ ہو گا۔

”سام...!“ اُس نے اُس شخص کو مخاطب کیا جو اُس کے پیچھے چل رہا تھا۔

”ہاں ڈاکٹر....!“

”آخر فتح کا منسلک کس طرح مل کیا جائے؟“

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم سب مل کر یا تو خود فنا ہو جائیں یا اُسے فاکر دیں۔“

”اوہ... اب اتنی اہمیت نہ دو اُس کیڑے کو۔ اُسکی مثال اُس کوے کی ہے جو کسی بھیزیرے کے سامنے سے ہڈی اٹھا لے جائے۔ وہ بیگم ارشاد والا بڑا نسخہ کر دینے پر تسلی گیا ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر یہ بھی تو سوچئے کہ ابھی تک وہ ہمارے بہت ہی خاص قسم کے پندرہ آدمیوں کو موت کے گھاث انداز پکالا ہے۔“

”ہاں... آں... مجھے اس کا بھی قلق ہے۔“ ڈاکٹر ڈریڈ نے لاپرواپی سے کہا اور ہونٹوں میں ایک سگریٹ دبا کر سلاکا نے لگا۔

”بیگم ارشاد کے لئے اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔“ اُس نے ایک کش لے کر کہا۔ ”اُس کی لڑکی کو پکڑ لیا جائے ہے وہ بے حد چاہتی ہے۔“ ورنہ ایسی صورت میں جب کہ نیلا ایک بھی ہاتھ سے جاتا رہا، اُس کا کیا بگاڑ سکتیں گے۔“

”یہ فتح شاید حق تھے کوئی غبیث روح ہے۔“ سام نے کہا۔ ”ورنہ نیلے بیگ کو اڑا لے جانا کی آدمی کے بس کاروگ تو نہیں تھا۔“

”چھوڑو...!“ ڈریڈ بُر سامنہ بنا کر بولا۔ ”وہ کر گیک کی غفلت سے ہوا تھا۔“

”یہ بھی درست ہے۔“

”وہ پھر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ڈریڈ نے کہا۔“ مگر نہیں یہ تھیک نہیں ہے۔“

”میا...?“

”یہی کہ اُس لڑکی کو اغواء کیا جائے۔ اس سے حالات پیچیدہ ہو جائیں گے۔ خیر دشواریوں اور پیچیدگیوں کی توجیہ پر وہ نہیں ہے۔ مگر فتح...!“

ڈاکٹر ڈریڈ رک گیا۔ یہاں اس کنخ میں وہ اکٹھ گھاس پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ جگہ جنمیلی کی جھاڑیوں

سے گھری ہوئی تھی اور یہاں ہر وقت اُنکے پہلوں کی بھیں بھیں مہک پکڑاتی رہتی تھیں۔ ڈریڈ ایک درخت کے آدمی کے ہوئے تھے پر کہیاں میک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی پیشانی پر گھرے تھکر کی وجہ سے بکلی بکلی سلو میں ابھر آئی تھیں۔

سام دوسرا طرف متوجہ تھا۔ فتح اُنکر اُس نے سمیت زمین پر ڈھیر ہو گیا اور ٹھیک اُسی وقت ایک فائز بھی ہوا۔ گولی ڈریڈ کے بائیں پہلو کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا لیکن تازہ میں پر لڑھتا ہوا اُس کے طرف بڑھ رہا تھا۔

ڈریڈ نے پیچھے بہتے ہوئے تھے پر دو تین فائز کے لیکن ایک بھی گولی اُس پر نہ پڑ سکی۔ پہنچ نہیں ڈریڈ کا نشانہ خطا کر رہا تھا یا اُس لڑھکتے ہوئے تھے کی خرکت کچھ اس انداز کی تھی کہ اُس پر گولیاں نہ پڑ سکتیں۔

”اوہ... سام... گدھ۔“ ڈاکٹر ڈریڈ دانت پیس کر غریا۔ ”کھڑا کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کو ہو کھلے تھے میں گھسا ہوا ہے۔“

فتح اُن کے سامنے تھا۔ وہ اتنی ہی پھرتی سے اُس کو ہو کھلے تھے سے لٹکا تھا جیسے کوئی چہا اپنے سوراخ سے نکلے۔ اُس نے چھوٹتے ہی دو فائز ڈاکٹر ڈریڈ پر جھوک دیتے تھے۔ لیکن اُس کا نشانہ بھی غلط ہی رہا۔ اور پھر دوسرا فائز ڈاکٹر ڈریڈ کو دوسرا دیا کی سیر کر رہی دیتا لیکن اُسی وقت سام نے اُس پر چھلانگ لگائی اور اُس کا ہاتھ بہک گیا۔ کچھ بھی ہو وہ سام کی گرفت میں نہیں آسکا۔ اُس کے نیچے سے نکلتے نکلتے اُس نے پھر ڈاکٹر ڈریڈ پر فائز کر دیا۔ ڈریڈ اپناریو اور خالی کر کپا۔ تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اس بار بچ سکا۔ اگر وہ خود کو زمین پر گرانہ دیتا تو جسم کے کسی نہ کسی حصے پر گولی ضرور گئی ہوتی۔ فتح سمجھا شاید اس بار وہ کامیاب ہو گیا ہے لہذا اُس نے سام کو رویا اور کی زد پر لیتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ہاتھ اور پر اٹھادو۔“

سام نے بڑی بایوسی سے ڈاکٹر ڈریڈ کی طرف دیکھا جو زمین پر اونڈھا پڑا ہوا تھا۔ فتح نے بائیں ہاتھ سے چاقو نکال کر اُس کی طرف پھیکتے ہوئے کہا۔ ”ڈریڈ کی ناک کاٹ کر مجھ دو۔ میں یہ ناک اُس نفھی سی قبر پر رکھوں گا جو آج بھی اُس کے لئے بے چین ہو گی۔“ سام چاقو اٹھانے کے لئے جگا۔ پھر کانپتا ہوا ڈریڈ کے پاس آیا اور ڈریڈ اب بھی اُسی طرح ہے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

شاید فتح بھی ڈریڈ کی ناک کٹنے کا دل کشا منظر ہی دیکھنے کے لئے آگے بڑھ آیا تھا۔ لیکن دوسرا ہی لمحے میں اُسے اپنی اس از خود رفتگی پر پچھتا پڑا۔ ڈریڈ لیٹے ہی لیٹے اُس پر جھپٹ پڑا تھا۔

ریو اور اُس کی گرفت سے نکل گیا اور وہ خود ڈریڈ کے نیچے دب کر رہا گیا۔
”سام چا تو....!“ ڈریڈ ہڑا۔ ”میں اسے بکرے کی طرح ذبح کروں گا۔“

لیکن پھر خود ہی کسی ہمینے کی طرح ڈکرا کر دوسرا طرف الٹ گیا اور فتح.... وہ ہر نوں کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا چہار دیواری کی طرف جا رہا تھا۔ سام اُس کے پیچے دوڑا۔ لیکن وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ فتح بندروں کی طرح دیوار پر چڑھ کر دوسرا طرف کو دیگا۔

سام کو رک جاتا پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اب فتح کو پالینا مشکل ہی ہو گا کیونکہ چہار دیواری کے اُس طرف کروندوں کا جگل تھا۔ یہ عمارت دراصل شہر سے دس میل دور ایک گاؤں میں واقع تھی۔

پھر وہ کٹھ میں واپس آیا۔ ڈاکٹر ڈریڈ گھاس پر بیٹھا ہوا تھا اور اُس کا چہرہ کچھ اس طرح اترتا ہوا ساظھر آ رہا تھا جیسے جسم کے کسی حصے میں ناقابل برداشت قسم کا درد ہو رہا ہو۔

”تم.... نمک حرام....!“ وہ سام کی طرف انگلی انھا کر مضمحل آواز میں بولا۔ ”میری ناک کاٹنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”اوہ.... ڈاکٹر.... میں سمجھا تھا.... شاید.... آپ....!“

”مر گئے....!“ ڈریڈ نے ہڑانے کی کوشش کی لیکن پھر کراہ کر خاموش ہو گیا۔ اُس کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سانس لینے سے بھی جی چڑا رہا ہو۔

”اب.... پھر....!“ وہ ہاتھ اٹھاتا ہوا رک کر بولا۔ ”یہاں سے بھی بھاگنے.... کی.... کوشش.... کرو.... جلدی.... مجھے.... اندر.... لے چلو۔“

وہ زمین پر چلتی کر کر اپنے لگا اور سام بول کھلا کر عمارت کی طرف بھاگا۔



بیگم ارشاد نے انور کو بہادیت تو کردی تھی کہ وہ اُس کو تھی سے دور رہے لیکن انور کی دانت میں یہ ایک لغوبات تھی۔ کوئی تھی سے دور رہ کر وہ اس بلیک میلر پر ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا تھا۔

لیکن وہ اس سلسے میں احتیاط ضرور برست رہا تھا۔ اس بار اُس نے میک اپ بھی ایسا ہی کیا تھا جس کے بارے میں اُس کا خیال تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی اُسے نہیں پہچان سکے گا۔

اور وہ مستقل طور پر کوئی تھی ہی میں رہ پڑا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ بیگم ارشاد کو شکار کے گوشت کا شوق تھا اور انہیں دنوں اُس کے یہاں کا شکاری بیمار پڑ گیا تھا۔ اس طرح انور کو اس کی لا علی میں وہاں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔

جیسے ہی دونوں ڈکنی ٹیل کپاٹ میں قدم رکھتے وہ ہوشیار ہو جاتا۔ اس دوران میں اُس نے محوس کیا تھا کہ بوڑھاڑ کنی ٹیل بیگم ارشاد سے فلٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور نوجوان ڈکنی ٹیل شاہینہ سے۔

اس وقت بھی نوجوان ڈکنی ٹیل شاہینہ کے ساتھ لان پر ٹھہر رہا تھا۔ اور انور ایک ایسی جگہ چھپ گیا تھا جہاں سے دونوں کی گفتگو سن سکتا تھا۔

نوجوان ڈکنی ٹیل شاہینہ سے کہہ رہا تھا۔ ”میرے ڈیڈی بالکل ڈفر ہیں۔ انہیں آج تک ہی نہیں معلوم ہو سکا کہ کسی عورت سے کس طرح گفتگو کرنی چاہئے۔“

”تم انہیں سمجھاتے نہیں۔“ شاہینہ مسکرائی۔

”ارے توبہ۔“ وہ اپنا کان پکڑ کر بولا۔ ”اس وقت تک نہیں سمجھا سکتا جب تک کہ وہ اپنی موچھیں نہ صاف کر دیں۔ ایک موچھے کے بال میری ناک میں گھس گئے تھے اور چھینکتے چھینکتے میرا بُر احال ہو گیا۔ ڈیڈی از اے پر فکٹ ڈفر۔ یو سی۔“

شاہینہ نے بُر اسامنہ بنیا مگر کچھ بولی نہیں۔

”ایک بار وہ اپنی ایک دوست کی بڑی بہن سے کہنے لگے۔“ ڈکنی ٹیل نے کہا اور ہٹنے لگا۔ پھر بدقت تمام نہیں پر قابو پانے کے بعد بولا۔ ”انہیں اپنی اُس دوست سے کچھ کچھ محبت ہو چلی تھی لیکن آپ ایک دن.... اُس کی بڑی بہن....!“

”میں اُس کی بڑی بہن کے متعلق کچھ نہیں سننا چاہتی۔“ شاہینہ جھلانی۔

”چلنے تو میں اسی کے متعلق بتاؤں گا۔ وہ بھی بڑا لچپ قصہ ہے۔“

شاہینہ کی جھلماہث اور بڑھی اور اُس نے چھپتا ہوئی آواز میں کہا۔ ”میا میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ میرے ساتھ ضرور ہٹھیں؟“

”اوہ.... آپ خفا ہوتی ہیں۔“ وہ دردناک آواز میں بولا۔ ”آپ کو کیا معلوم....!“

وہ اپنے سینے پر اس انداز میں ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گیا جیسے خون کی قی ہونے والی ہو۔

”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں....?“

”کاش میں ہوش میں ہوتا۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے دوپھر کا کھانا رات کو کھاتا ہوں اور رات کا کھانا دوسرے دن دوپھر کو۔ اکثر دن میں دوبار شیو کردا تھا ہوں لیکن جب ہوش آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ڈیڈی کا شیو کر رہا تھا اور ڈیڈی مسکرا کر میرا شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

”ڈکنی ٹیل.... تم اپنی بکواس بند کرو۔ ورنہ مجھے کسی نوکر کو بلانا پڑے۔“

”کیوں تم اوس کیوں ہو؟“

”میری نکہ میں تمہاری طرح نیک نہیں بن سکتا۔“
”تم میں کون سی نہ رائی ہے۔“ میری سلکٹن نے حرمت سے کہا۔ ”تم پور ہو، نہ ڈاکو، نہ شرابی... نہ زانی۔“

”مگر میرا بکرا تو مجھے اچھا نہیں سمجھتا۔“

میری ہنسنے لگی اور پھر سبجیدگی سے بولی۔ ”نہیں تم دونوں فرشتے ہو۔ اپنی زندگی میں مجھے پہلے دو آدمی طے ہیں جنہوں نے میری مرضی کے خلاف مجھے استعمال نہیں کیا۔ ویسے بھی یہاں میں نے عام طور پر محسوس کیا ہے کہ مشرق ابھی اخلاقی طور پر اتنا نہیں گرا جتنا مغرب گرچکا ہے۔“
”شکریہ...!“ حمید بھی اس موضوع پر سبجیدہ ہو گیا کیونکہ یہ مشرق کے وقار کا سوال تھا۔
”میں سوچ رہا تھا کہ تم ہم چیزے فراہد آدمیوں کے جال میں پھنسنے والی ہو۔“ حمید نے پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

”کیوں...؟“ میری چوک کر اُسے گھوڑنے لگی۔

”اُرے یہ فراہد نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم نے تمہیں اس طرح پناہ دی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمہاری مدد سے ذریعہ تک پہنچ سکیں۔“

”میری مدد سے؟“ اُس نے حرمت سے کہا۔ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ”شاید آپ کسی غلط فہمی میں بجا لایں۔ یہاں ڈریڈ کی تقریباً تین درجن پناہ گاہیں ہیں۔ مجھے صرف نو گھباؤں کا علم ہے لیکن فریدی ایسی چیزیں عمارتوں سے واقف ہیں جہاں ڈریڈ پناہ لے سکتا ہے۔ پھر میں ان کی کیا مدد کر سکوں گی۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ گھباؤں سے واقف ہیں؟“

”انہوں نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔“

حمدید کے لئے یہ اطلاع بالکل نئی تھی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ فریدی ڈریڈ کی مختلف پناہ گاہوں کا علم بھی رکھتا ہے۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر بولا۔ ”تم اُس زرد پوش آدمی کے متعلق کیا جانتی ہو جس کی دلکشی بھال تمہارے سپرد تھی۔“

”بس اُس کی دلکشی بھال ہتی کرتی تھی۔ اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ کوئی صحیح الدیماغ آدمی نہیں ہے۔“

”ڈریڈ کے ساتھیوں میں اُس کی کیا حیثیت ہے؟“

”یقیناً بلاسیئے... بشر طیکہ وہ مجھ سے زیادہ اچھا ہو۔“

شاہینہ جو آپ سے باہر ہو رہی تھی ہاتھ چھوڑ بیٹھی۔ ... پٹناخ کی آواز اتنی ہلکی بھی نہیں تھی کہ دور دور تک شہ پھیلتی۔ لیکن ڈنکنی میل نے نہ تو گال سہلایا اور نہ اس کے چہرے ہی سے یہ ظاہر ہوا کہ اُس نے ابھی ایک عدد زوردار تھپٹر سیور کیا ہے۔

”اُس نے کہا تھا۔“ وہ آسان کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ”اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپٹر مارے تو تم دوسرا بھی پیش کر دو۔“

چیز پر شاہینہ نے دوسرے گال پر بھی تھپٹر سیور کر دیا اور ڈنکنی میل نے جیب سے روپاں نکالتے ہوئے کہا۔ ”لایے... میں آپ کا ہاتھ صاف کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے گال گندے رہے ہوں۔“

شاہینہ لاپرواپی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ وہ کافی تیز رفتاری سے عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ انور نے ڈنکنی میل کے ہونٹوں پر ایک بڑی سفاک بی سکراہٹ دیکھی۔

بھیانک رات

میری سلکٹن کی ہیئت ہی بدلتی تھی۔ نہ وہ اب سنگار کرتی اور نہ گھنٹوں تک کے اسکرٹ پہننی بلکہ ایسے ہی لباس میں رہتی جس سے پورا جسم ڈھکا رہے۔ وہ ساڑھی نیزادہ پسند کرتی تھی۔ اب اُس کے ہونٹوں پر نہ لپ اسٹنک کی گھری تہہ نظر آتی اور نہ گالوں پر روٹکی سرخی لیکن وہ اس کے باوجود بھی دلکش نظر آتی تھی۔ پہلے کی میری اور اب کی میری میں زمین آسان کا فرق ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا چیزے وہ اب تک پا کیزگی ہی کی زندگی بس کرتی رہی ہو۔

حمدید کے لئے میری سلکٹن کی یہ حرمت اگلی تبدیلی میں بھی تھی۔ وہ اُس کی اس کایاپٹ کو دیکھتا اور عش کرتا۔ اول تدوہ اپنا زیادہ تروقت باعل پڑھنے میں صرف کرتی تھی اور اگر کبھی حمید کو اُس سے گھنگو کرنے کا موقع بھی ملتا تو ولیوں اور پاکباز بزرگوں کے قبے چھڑ جاتے۔

آج حمید بڑی مشکل سے اُسے ڈھب پر لایا تھا اور وہ دل کوول کر ہنس رہی تھی۔ مگر کسی معموم پنچی کی طرح اس میں نہ بناوٹ تھی اور نہ ترغیب کی جملیاں۔ حمید کہہ رہا تھا۔ ”میں آج بہت اُس ہوں اور تم قتھے لگا رہی ہو۔“

"میں یہ بھی نہ بتا سکوں گی۔ وہ پاگل ضرور ہے مگر عورتوں کے لئے ہر وقت اُس کی رال
چکتی رہتی ہے۔"

"ڈریٹہ سے اُس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ دیے اکثر میں نے دیکھا ہے کہ اُس نے ڈریٹہ کے منہ پر بھی اُسے گالیاں
دی ہیں اور وہ خلاف موقع سن سکتی رہتا ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں فتح سے ہمدردی ہے۔"

" بلاشبہ مجھے اُس سے ہمدردی ہے۔"

"میاہم نہیں جانتیں کہ وہ کتنی آدمیوں کا قاتل بھی ہے؟"

"ہو گا....!" میری نے لاپرواں سے اپنے شانوں کو جنبش دی۔ "پہلے وہ قاتل نہیں تھا۔
پہلے وہ ایمان دار آدمی کی طرح محنت سے اپنی روزی کما تھا۔ پھر ڈریٹہ سے بدلتے ہیں کی دھن
میں غلط راستوں پر نکل گیا اور اب وہ ڈریٹہ کی طرح ایک برا آدمی ہے۔ وہ بے دریغ دوسروں
کے مال پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ بے دریغ لوگوں کو قتل کرتا ہے مگر اُسے نہ بھولو کر پہلے وہ ایک بے
ضرر اور ایمان دار آدمی تھا۔ اُسے راہ پر ڈالنے والا ڈریٹہ ہے۔ لہذا ڈریٹہ کے مقابلے میں مجھے
اس سے ہمدردی ہی ہوئی چاہئے کیا تم اس کے لئے ہمدردی نہیں محسوس کرتے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہمارا کام تو مجرموں کو قانون کے حوالے کرتا ہے۔ خواہ ان کے مجرم بن
جانے کی وجہ کچھ ہو۔"

کچھ دیر خاموش رہی پھر حمید بولا۔ "کیا ذاکر ڈریٹہ یہاں کی کسی مال دار عورت کو بیک میل
کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟"

"ہاں.... لیکن میں نہیں جانتی کہ وہ عورت کون ہے۔ البتہ یہ جانتی ہوں کہ اُس عورت
سے اُس کا مطالبه دو کروڑ کا ہے۔"

"میں ربنا چنانچا ہتا ہوں! حمید اس گھنگلو سے اکتا کر بولا۔

"نجھے افسوس ہے کیپیں! میں عہد کر چکی ہوں کہ بقیہ زندگی کوواریوں کی طرح بس رکوں گی۔"
حید پچھے کہنے ہی والا تھا کہ چار نوکر لکڑی کا ایک بہت بڑا صندوق اٹھائے اندر داغل ہوئے اور
اُسے اسٹور روم کی طرف لے جانے لگے۔ دفعاً وہ صندوق ایک ستون سے مکرایا اور تھوڑی سی
جگہ کا پلاسٹر اکھر گیا۔

"او انہو...!" حمید دھڑا۔ "دیکھتے نہیں۔ کہ... زھڑا ہوا پلاسٹر تمہاری کھالیں اونھڑے

کا سبب نہ بن جائے مگر یہ صندوق کیا ہے؟"

"صاحب نے بھجوایا ہے۔" ایک نوکر نے جواب دیا۔

حمید پھر میری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم دیکھ رہی ہو۔ ستون کا تھوڑا سا پلاسٹر اتر گیا ہے۔
کرتل صاحب ابھی تشریف لارہے ہوں گے۔ سب سے پہلے اسی ستون پر نظر پڑیں گے۔ ایک ایک
نیکے پر نظر رہتی ہے اُس شخص کی۔ بھلا ایسے شخص کے ساتھ کون شادی کرنا پسند کرے گی؟"
اتباہوش مند ہوتا تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہاں تم کہہ سکتی ہو کیونکہ تم بقیہ زندگی کوواریوں کی طرح بس رکوں گی۔"

وہ پچھہ نہ بوی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر باہل کے درقِ الٹ رہی تھی اور حمید بہسا منہ بنائے
ہوئے اپنے پاپ میں تمباکو پھر رہا تھا۔

ٹھیک پچھے بے فریڈی دہا آیا۔ وہ سیدھا اسی طرف چلا آیا تھا۔ لیکن اُس نے آتے ہی وہی کیا
جسکی پیشین گوئی حمید پچھہ دیر پہلے کر پکھا تھا۔ وہ ستون کے اوھڑے ہوئے پلاسٹر کو دیکھتا ہوا پھر بولا۔
"یہ پلاسٹر کیسے اونھڑ گیا....؟"

"صندوق سے پوچھئے۔" حمید نے لاپرواں سے جواب دیا۔ "لیکن صندوق یہی جواب دے گا
کہ نوکر جانیں۔ نوکروں سے ہرگز پچھہ نہ پوچھئے گا ورنہ وہ سوچیں گے اتنا بڑا آدمی ہو کر اتنی سی
بات کے لئے جواب طلب کرتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم کسی صندوق کا تذکرہ کر رہے ہو؟"

"وہی جو آپ نے بھجوایا تھا۔ اب یہی جملہ لاطینی میں دہرا دوں؟"

"میں نے کوئی صندوق نہیں بھجوایا تھا۔"

"کیا...?" حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "وہ اسٹور روم میں موجود ہے۔"

فریدی اُسی حصے کی طرف جھپٹا جہاں اسٹور روم تھا۔ حمید بھی تقریباً دوڑتا ہوا اُس کے
ساتھ چل رہا تھا۔

فریدی اسٹور روم میں گھس پڑا اور حمید نے ایک صندوق کی طرف اشارہ کیا۔

یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اُس کی اونچائی تقریباً ڈھانی فٹ تھی اور لمبائی چار فٹ، چوڑائی بھی
تین فٹ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

فریدی نے اُس کا ڈھنکن اٹھا دیا لیکن صندوق خالی تھا۔

"اوہ...!" حمید کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ شاید اتنا وزنی تھا کہ اسے چار آدمی اٹھا کر

”ابس کی وہ خواہش پوری نہ ہو سکی جس کے لئے اس نے اس زندگی میں قدم رکھا تھا۔“

”مجھے بھی افسوس ہے۔“ فریدی اُسے فرش پر ڈالتا ہوا بولا۔

فتحی لاش حمید کو عجیب سی لگ رہی تھی اور اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُسے وہ فتحی تسلیم کرنے جس نے ایک رات ان دونوں کو چیلنج کیا تھا۔ وہ تو اُسے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی فٹ پا تھوڑے کوئی مقلوب حقیر سردی سے اکٹ کر مر گیا ہو۔

”اس کے کارنے سے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔“ فریدی میری سے کہہ رہا تھا۔ ”آج تک ایسا دلیر اور بے باک مجرم میری نظروں سے نہیں گزرا۔ مگر اس کی اس جہالت پر اسکے کارنے سے ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی نخاساچہ مصنوعی موچیس لگا کر بوڑھان بننے کی کوشش کرے۔“ پھر نہ جانے کیوں حمید بھی اس کے لئے رنجیدہ ہو گیا۔ نوکر صحن میں کھڑے پلکیں جپھکا رہے تھے اور پورے گھر پر کچھ ناتھی سی فضاظاری ہو گئی تھی۔

لیکن یہ بیک سب کی آنکھوں میں بیکل کو نہ گئی۔ کیونکہ فتح اچاک اچمل کر راہداری کے دروازے کے قریب جا گرا تھا۔ پھر اس نے راہداری میں چلانگ لگائی۔

”لینا...!“ حمید دہڑکر خود بھی چھپتا۔ فریدی بھی دوڑ پڑا تھا۔

پھر جیسے ہی فتح پورچ سے نکل کر عقبی پارک کی طرف بھاگا آٹھ دس خونوار قسم کے کتے اُس پر جھپٹ پڑے لیکن فتح کی تیز قماری کی واڈی بینی پر لگی کوئکہ وہ انہیں کافی بیچھے چھوڑ گیا تھا۔ مگر... پھر وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرا اور کتوں نے اُسے جالیا۔ فریدی دوڑ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ لیکن حمید نے محسوس کیا کہ فریدی کچھ مضطرب سانظر آنے لگا ہے۔ دیسے بھی جب فتح اس طرح دھوکا دے کر نکل بھاگا تھا تو اُس نے بڑے بے اختیار انداز میں قبضہ لگایا تھا۔ اور یہ بیک بھر اُس نے فریدی کو ہستے دیکھا کیونکہ دوسری طرف فتح نے کتوں سے باقاعدہ جگ شروع کر دی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا چاقو تھا اور دوسرے ہاتھ میں کوٹ جو اُس نے حرمت انگلیز پھرتی کے ہاتھ اپنے جسم سے اٹانا تھا۔

اب تک کئی کتے نری طرح خلی ہو چکے تھے۔

”اگر... یہ چکر نکل جائے تو مجھے ان یعنی کتوں کے مرنے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہ ہو گا۔“ فریدی نے مضطربانہ انداز میں کہا اور پھر حمید کی طرف مراجور یا الور نکال چکا تھا۔

”خبردار...!“ وہ اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ”تمہیں اسے اس طرح ہلاک کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔“

اندر لائے تھے۔“

فریدی پہنچ لئے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”سارے دروازے بند کر دو۔ نسیم سے کہہ وہ تمکن آدمیوں کو راٹھلوں سمیت عقبی پارک میں لے جائے اور ادھر تو کتے چھوٹے ہی ہوئے ہیں۔“ ”یعنی کوئی آدمی اس صندوق میں بیہاں آیا ہے۔“

”جلدی کرو۔“

لیکن پھر فراؤ ہی کسی خیال کے تحت اُس نے ہاتھ اٹھا کر اُسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی نظر ایک گوشے کی طرف تھی جہاں گھوڑی کے پرانے صندوقوں کے ڈھیر تھے۔ اُس نے ہونٹوں پر اٹکی رکھ کر حمید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود آہستہ اُس گوشے کی طرف بڑھا اور پھر اچاک حمید نے صندوق ایک دوسرے پر گرتے دیکھے۔ فریدی نے کسی کی ناگ پکڑ رکھی تھی۔ حمید بوکھلا کر آگے بڑھا۔

فریدی نے جھنمکارا لیکن اُس آدمی نے کسی سانپ کی طرح زمین پکڑ لی تھی اور پھر جب وہ پلٹا تو کسی ایسے سانپ ہی کی طرح پلٹا جس کی دم پکڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔

حمدیکے طلن سے ایک تحریک امیز سی چیخ نکلی.... یہ فتح تھا... اور فریدی کے یازوں میں لٹکا ہوا کو شش کر رہا تھا کہ کسی طرح اُس کی گردن اُس کے ہاتھوں میں آجائے۔

”یقین دیجئے... سالے کی بڑیاں چور ہو جائیں۔“ حمید دہڑا لیکن فریدی اس مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ پتہ نہیں فتح نے اُسے اس کا موقع نہیں دیا تھا ایسا خود اُس نے ہی ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ فتح ٹھوڑی دیر تک تھا مگر پھر اُس نے ہاتھ پر ڈال دیئے۔

دوسرے ہی لمحے میں فریدی داشتے ہاتھ سے اُس کی گردن پکڑتے کسی مردہ چھپکلی کی طرح لٹکائے ہوئے تھا... اور اسی طرح وہ بر آمدے تک چلا آیا۔ فتح کی آنکھیں بند تھیں اور اُس کی سانسیں بھی رک گئی تھیں۔

جیسے ہی میری سلطان کی نظر اُس پر پڑی وہ چین مار کر کھڑی ہو گئی۔ ”یہ... یہ... فتح...!“ ”ہاں... میں اسے اچھی طرح پہنچاتا ہوں۔“ فریدی مکرایا۔

”یہ... یہ شاید... مر گیا۔“ میری قریب آکر پہنچی پہنچی آنکھوں سے اُسے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”ہاں... شاید...!“ فریدی نے اُس کو اسی طرح لٹکائے ہوئے نیچے سے اوپر تک دیکھ کر کہا۔ پھر حمید سے بولا۔ ”یہ اُسی نیلے بیک کے چکر میں آیا تھا۔“

”میں اس کے لئے رنجیدہ ہوں۔“ میری نے بھراہی ہوئی آواز میں کہا۔

میلیں کی مگر انی کرتے ہوئے اُسے چوتھا دن تھا۔ وہ روزانہ بلانا غم یہاں آتے تھے لیکن ان کی آمد کا وقت مقرر نہیں تھا۔ وہ کسی وقت بھی آسکتے تھے لیکن انور نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ یہ یگم ارشاد نے ملے بغیر انہیں واپس کر دیا ہو۔ البتہ شاید ان سے کتراتی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اُس کے ہونٹ نفرت سے سکر جاتے۔

ایک بار انور نے فون پر یہ یگم ارشاد سے ڈکی میلیں کے متعلق پوچھا۔ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتی کہ وہ دونوں کس قسم کے آدمی ہیں۔ دیسے سوال یہ ہے کہ آخر یہ روزانہ کیوں آتے ہیں جب کہ بُرنس کی بات بھی ملے ہو چکی ہے۔ پہلے تو بہت جلدی میں تھے۔ انہیں عجلت میں الکٹینڈ واپس جانا تھا۔ اسی لئے انہوں نے تجارتی معاملوں کی سکیل میں جلدی کی تھی۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہیں رہ پڑنے کا رادہ رکھتے ہوں۔“

”ان کا قیام کہاں ہے؟“

”نیاگرا ہو ٹل میں...!“

”ٹھیک....!“ انور نے کہا تھا۔ ”میں نے انہیں وہاں چیک کرنے کی کوشش کی ہے کئی بار... لیکن وہ وہاں نہیں ملے۔ یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے کمرے ضرور لے رکھے ہیں مگر ارشاد نادر ہی وہاں جاتے ہیں۔ وہاں رات تو انہوں نے ایک بار بھی نہیں برس رکی۔“

”انور....!“ یہ یگم ارشاد نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ ”تم مجھ کام کر رہے ہو مگر اُس بلک میلر کے ساتھ ہی ساتھ وہ آدمی بھی ضروری ہے جس کے بازو پر سرخ نشان ہے۔ چالیس ہزار تمہارے ہیں اور تم یہ سمجھو کہ وہ تمہارے ہی پاس ہیں۔ اخراجات کی رقم الگ۔ اُس سے کوئی غرض نہیں۔“

”کہاں دو کروڑ.... کہاں صرف چالیس ہزار....!“

”وہ مجھ سے دو پیسے بھی نہیں لے سکتا۔ خواہ میں فنا ہو جاؤں۔“

اس کے بعد گفتگو ختم ہو گئی تھی اور انور ابھی تک ان لوگوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم کر سکتا تھا جو کچھ یہ یگم ارشاد کو بتایا تھا لیکن اُس کی تگ دو جاری ہی رہی۔

آج شام ہی اُسے شبہ تھا کہ آج یہاں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اُس نے کئی خاص باتیں نوٹ کی تھیں۔ نوکروں کے کوارٹروں کے چیچھے اُسے جھائزیوں میں ربراکا ایک لمبا سا پاپ پڑا ہوا ملا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ وہ عرصہ سے وہیں پڑا رہا ہو گا۔ لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل نیا تھا اور کم از کم ابھی تک دھوپ یا پانی سے محفوظ رہا ہے۔ دوسرا طرف اس عمارت کی

”آپ ان کتوں کو آواز دے کر ہٹاتے کیوں نہیں؟“ میری نے روہانی آواز سے کہا۔ ”یہ اس وقت میری نہیں سنیں گے کیونکہ قریب قریب سمجھی زخمی ہو چکے ہیں۔“

”میں اسے بچاؤں گی۔“ میری مجھ ندانہ انداز میں آگے بڑھی لیکن فریدی نے اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”پاگل نہ بنو تمہاری بوٹیاں بھی ہمیں نہ ملیں گی۔“

”مجھے چھوڑ دو.... مجھے چھوڑ دو۔“ وہ پاگلوں کی طرح چھتی رہی۔ شاید بچھے اُس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ وہ بالکل ہمیشہ اسی قسم کا کوئی دورہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چھتی رہی۔ ”فُخ... فُخ... میرے پچھے... میرے بیٹھے... میں آرہی ہوں۔ میرے بیٹھے... میرے بیٹھے۔“ اور پھر وہ بے ہوش ہو کر بازو پر جھوول گئی۔

دوسری طرف فُخ اُسی جوش و خروش کے ساتھ کتوں سے لڑ رہا تھا۔ میں کہتے بالکل ہی بیکار ہو کر چھتی ہوئے زمین پر گھست رہے تھے۔ فریدی نے بے ہوش لڑکی کو وہیں گھاس پر ڈال دیا۔ وہ اُس لڑائی میں اس طرح محو ہو گیا تھا جیسے کوئی بچہ کسی بازی گر کے کمالات دیکھ رہا ہو۔

صرف فریدی ہی کی یہ کیفیت نہیں تھی بلکہ جتنے بھی وہاں کھڑے تھے سب کا ایسی حال تھا۔ اب کے سات پڑنے لگے تھے۔ دفناً ایک بار فُخ نے ایک لمبی دوڑ گائی اور کتوں کو جھکائی دے کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔

”میرے خدا....!“ فریدی نے ایک طویل سانس لی۔ ”بلیوں اور بندروں سے بھی زیادہ پھر تیلا۔“

اور پھر انہوں نے دیکھا کہ فُخ بندروں کی طرح ایک درخت سے دوسرے درخت پر چلا گئ لگاتا ہوا چہار دیواری کی طرف نکلا جا رہا ہے۔ یقین کہتے اُس کے کوٹ کی دھیان اڑا رہے تھے اور میں کہتے اُن درختوں کے نیچے اچھتے پھر رہے تھے جن پر فُخ چلا گئ لگاتا تھا۔

ذرا ہی سی دیر میں فُخ دیوار پر نظر آیا اور اُس نے سیدھے کھڑے ہو کر اس طرح اپنا ہاتھ ہلا کیا جیسے ”ناتا“ کہہ رہا ہو.... پھر وہ دوسرا طرف کو دیکھا۔

فریدی کی محیت ختم ہو گئی اور اُس نے ہنس کر کہا۔ ”تم نے دیکھا؟“ اور پھر وہ اُن کتوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”میری کو اندر لے جاؤ۔ ڈاکٹر کو فون کرو۔“



رات تاریک تھی۔ انور ارشاد منزل کے نوکروں کے قریب نہیں رہا تھا۔ ڈکی

پشت پر ایک جگہ جھاڑیوں میں اُسے کچھ ایسے اوزار پرے ملے جن کی مدد سے دروازے اور قفل پر آسانی کھولے جاسکتے تھے۔ انور نے انہیں بھی جوں کا توں پڑا رہنے دیا۔ لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے کیا کرٹیں چاہئے۔ کیا کرٹی فریدی کو اس کی اطلاع دے۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اُسکی صورت میں وہ اُن چالیس ہزار سے محروم ہو جائے گا جو کچھ ہی دنوں کے لئے سہی اُس کی زندگی شاندار ضرور بنا دیتے۔ مگر وہ تھا کہیں کھیل ہیتے بگاڑ دے۔

وہ کافی دیر تک اسی اوہیز پن میں رہا اور پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی اطلاع کر تی فریدی کو نہیں دے گا۔ وہ پہلے بھی کئی مرکے تھاہی سر کر چکا تھا۔ اُسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ حالات صرف دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ یا کام بن جائے گا یا بگڑ جائے گا بن جانے کی صورت میں اُس کے چالیس ہزار کھرے ہو جائیں گے اور اگر کام بگڑ گیا تو بھی اُس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بیگم ارشاد اسے معلوم نہیں معلوم ہوتی تھی۔ آخر وہ اُس آدمی کے وجود کو پولیس سے کیوں چھپانا چاہتی ہے جس کی تلاش میں ہے۔ وہ آدمی اُس کے لئے یقیناً بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ اُس کے لئے چالیس ہزار کیوں خرچ کرتی اور وہ اُسے قانون کی نظرؤں میں بھی نہیں لانا چاہتی۔ انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بلیک میل سے بھی زیادہ پولیس سے خائف ہے۔ پھر ایسی صورت میں اگر وہ گڑھے میں جاگرتی ہے تو اُسے اُس سے ہمدردی کیوں ہو۔ وہ اپنی کسی غیر قانونی حرکت کی سزا ضرور بھلجنے گی۔

بہر حال یہ انور کا فیصلہ تھا کہ وہ کسی کو بھی ان حالات کی اطلاع نہیں دے گا۔ رات ہوتے ہی وہ بہت زیادہ محتاط ہو گیا۔ اُس کا قیام بھی نوکروں کے کوارٹروں ہی میں سے ایک میں تھا۔ تقریباً گیارہ بجے جب سب ملازمین اپنے کوارٹروں میں بیٹھ گئے تو انور آہستہ سے رینگتا ہوا اپنے کوارٹ سے باہر نکل آیا۔ یہاں گھر اندر ہی رہا تھا۔ کپاؤٹ کا یہ حصہ عموماً تازیک ہی رہا کرتا تھا۔ وہ کوارٹروں کے عقب میں آیا۔ زمین پر پڑے ہی پڑے رہ کے اُس پاپ کو ٹوٹنے لگا جسے سر شام ہی وہاں دیکھ چکا تھا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے زکا اور پھر اُسی طرح آگے بڑھنے لگا لیکن کچھ دور چلنے کے باوجود اُس پاپ کا سراغ نہ ملا اور انور نے مزید آگے بڑھنے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ اس اندر ہی میں زہریلے کیڑوں کا شکار بھی ہو سکتا تھا۔

لیکن وہ مڑ ہی رہا تھا کہ اُسے عجیب قسم کی بو محسوس ہوئی۔ کچھ میٹھی میٹھی سی دماغ پر اگنڈہ کر دینے والی بو۔ وہ اپنی ناک دبا کر بڑی تیزی سے مڑا اور اُس وقت تک نہیں رکا جب تک کہ اُس کا دم نہیں گھٹنے لگا۔ اب اُس پاپ کا مقصد اچھی طرح واضح ہو گیا تھا۔ اُس پاپ کے ذریعہ کوارٹروں

میں سیچھلک گیس پہنچائی جا رہی تھی تاکہ ملازمین بے ہوش ہو جائیں.... تو یقیناً یہ رات ہنگامہ خیز ثابت ہونے والی تھی۔

انور کو اکتوبر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اُس نے مالتی کی جھاڑیوں کے قریب سیدھے کھڑے ہو کر دو تین گھرے گھرے سانس لئے۔ یہاں کی فضایں گیس کا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ بڑی تیزی سے اصل عمارت کی پشت پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہاں بھی وہ دیر سے پہنچا۔ وہ نہ اسرار لوگ اپنا کام کر چکے تھے۔ اُسے عقینی دروازہ کھلا ہوا ملا۔ انور پھر رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ کیا اُسے اندر داخل ہونے کیلئے کوئی دوسرا انتہا اختیار کرنا چاہئے۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر سر ہلا کر اُسی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک نو میں راہداری تھی اور بالکل تاریک۔ شاید انور اُس رات بھی اس راہداری میں نکل آیا تھا۔ جب نوجوان ڈنکی ٹیل نے اُس سے سانپ والا ندماق کیا تھا۔ انور بے آواز چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک جگہ اُسے رکنا پڑا۔ کیونکہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کی روشنی راہداری میں بھی پھیل گئی تھی۔ اُس نے آہٹ لی اور جلد ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ کمرے کے اندر کوئی نہیں ہے۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے میں کمرے کے اندر قفل۔ یہاں بلب روشن ٹھاوار کرہا بالکل خالی تھا۔ البتہ ایک چیز نے فوراً ہی انور کی توجہ اپنی جانب مبذول کر دی۔ یہ ٹیلی فون تھا اور اس کا رسیور کریڈل میں ہونے کی وجہے میز پر پڑا ہوا تھا اور میز کے نیچے ایک سلپر نظر آیا۔ زنانہ سلپر جس کا استر نہایت نفس قسم کے تملک کا تھا۔ انور نے دوسرے سلپر کیلئے ادھر ادھر نظر دوڑا تھا لیکن وہ نہ مل سکا۔ تو گویا یہاں کوئی عورت کسی کو فون کر رہی تھی.... نہیک اُسی وقت اُسے یہاں سے اخالیا گیا۔ جس کا ایک سلپر بیہیں رہ گیا اور رسیور میز پر پڑا رہا۔ انور بڑی تیزی سے باہر نکلا۔ اُس نے اپنے جو تے اتار دیئے تھے اور ہوا کی طرح راہداری پرے کر رہا تھا۔ اس راہداری کے اختتام پر پھر وہی بڑا ہاں تھا جہاں ایک رات اُس نے جشن سالگرہ میں شرکت کی تھی۔ ہال میں روشنی نظر آرہی تھی۔ انور ابھی اُس کے دروازے سے دور ہی تھا کہ اس کا پیر کسی زرم چیز پر پڑا اور وہ چھل کر چیچھے ہٹ گیا۔ پھر اُسے اٹھانے کیلئے جھکا۔ یہ بھی ایک سلپر ہی تھا اور انور نے محسوس کیا کہ اُس کا استر بھی تملک ہی کا ہے۔

انور آگے بڑھ کر دروازے کے شیشوں سے اندر جھانکنے لگا اور جو کچھ بھی اُسے نظر آیا اُس کے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ اُس نے نہال میں شاہینہ اور بیگم ارشاد کے علاوہ تین آدمی اور بھی دیکھے۔ دو کے چہرے سیاہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے اور تیسرا کوئی مجبوں سا آدمی تھا۔ دیا پتلا اور لمبا سا۔ اُس کے چہرے پر ڈاڑھی بھی تھی مگر الجھی ہوئی سی۔ اُس کے چہرے پر نقاپ نہیں تھی۔

تم لوگوں کو خواہ تجوہ دھوکا دیتا رہا۔ میں فتح کے ہاتھوں ذلیل ہوتا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ کچھ دن غاموش بیٹھوں.... اوسام گدھے۔ کیا دیکھتا ہے۔ ماراں چوٹے کو۔“
سام چپ چاپ کھڑا پکیں جپکا تارہ۔ اچانک دھم سے کوئی فرش پر آکو اور انور کی آنکھیں حرثت سے پھیل گئیں۔

یہ ایک چھوٹا سا آدمی تھا اور اُس کی مٹھی میں چاقو دبایا تھا۔ اُس نے بوڑھے ڈنکی ٹیل کو دیکھ کر بندروں کی طرح دانت نکالے اور اُس کی پروادہ کے بغیر اُس پر چھلانگ لگادی کہ اُس کے ہاتھ میں روپاں ہے۔

اور بوڑھے کی پھرتی پر دنگ رہ گیا بلکہ اُس کی سمجھی ہی میں نہ آسکا کہ وہ سب کچھ آن واحد میں کیسے ہو گیا۔ ریو اور کارخ بھی ان دونوں کی طرف رہا اور چھلانگ لگانے والا چھوٹا آدمی اُس تھیلے میں بھی پکنچ گیا جو ایک ہی لمحہ پہلے بوڑھے ڈنکی ٹیل کی کرسے لٹکا ہوا تھا۔
بوڑھا تھیلے کے منہ کو بند کرتا ہوا کہہ رہا تھا ”تو تم اب آرام کرو تو خوڑی دیر۔ پھر تم سے بھی سمجھوں گا۔..... ہاں..... ہاں شوق سے تم اپنا چاقو اس تھیلے پر آزماؤ۔ اگر تم اسے کاث سکو تو میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔“

اس نے تھیلے کو ایک طرف ڈال دیا اور پھر ان دونوں کی طرف مزکر دہڑا۔ ”سام کے بچے تو کھڑا منہ دیکھ رہا ہے اسے مارتا کیوں نہیں جو تجھے ایک سال سے ذلیل کرتا رہا ہے۔“

”یہ جھوٹا ہے۔“ دوسرے آدمی نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں..... چور..... میں جھوٹا ہوں.... سام.....!“ اُس نے پھر سام کو لکھا اور سام کیک دوسرے آدمی پر ٹوٹ پڑا۔

”کیا کرتا ہے گدھے....!“ دوسرے نے کہا۔

”تم چور ہو۔“ سام دانت پیس کر بولا۔ ”تم نے ڈاکٹر ڈریڈ کا میک اپ کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ ایسا چوہا نہیں ہو سکتا جو فتح میسے حیر کیڑے سے ڈر کر بھاگتا پھرے۔“

”میں تجھے مارڈاں گا سام! ہوش میں آ۔“ دوسرے آدمی غریبا۔

پھر انور نے ان دونوں کو ایک دوسرے پر جھپٹتے دیکھا۔ بڑا عجیب کھیل تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس کی جیب میں بھرا ہوا ریو اور موجود تھا اور اسے اطمینان تھا کہ وہ سیل کھڑے کھڑے کھڑے کھڑے تھے۔ نوجوان ڈنکی ٹیل نے بڑی تیزی سے انہیں بے نقاب کر دیا۔
”آہا.... سام....!“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں سمجھا تھا شاید تم کر گیک ہو۔ اوسام گدھے۔ یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ میں ہوں۔ پچھلے سال سے میں نے روپوشی اختیار کر کھی تھی۔ یہ چور

جسم پر ایک لمبا ساز درنگ کا الباہد تھا۔ بیگم ارشاد سونے کے لباس میں اور بنگے پیر تھی۔ شاید وہ دونوں سلیپر اُسی کے تھے جو انور کو کچھ دیر پہلے ملے تھے۔

”تم اپنا دامنا ہاتھ کھولو۔“ ایک ناقاب پوش اُس مجھوں آدمی سے کہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے دابنے ہاتھ کی آستین اور انور بے ساختہ چوک پڑا۔ کیونکہ وہ سرخ نشان یہاں سے بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ یقیناً رہو پے ہی کے برابر رہا ہو گا اور بہت واضح۔

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔“ بیگم ارشاد نے کہا اور انور نے اُس کی آواز میں کسی قسم کی کمزوری نہیں محسوس کی۔ البته شاید بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

”یہ محض دھمکی نہیں ہے۔“ بیگم ارشاد۔ ”تمہارے وہ خطوط بھی میرے پاس موجود ہیں جو تم نے اُس میک میل کو تقویٰ تلاکھے تھے۔“

بیگم ارشاد کچھ نہیں بولی۔ صرف اسے گھورتی رہی اور وہ مجھوں ساز درنگ پوش آدمی اپنے ہونٹ چاٹ چاٹ کر شایدی کو گھورتا رہا۔ شایدی بھی بھی اُس کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

”دیکھوں تو وہ خطوط کیسے ہیں؟“ بیگم ارشاد نے طنزیہ لمحہ میں کہا۔

”بڑی چالاک ہو۔“ ناقاب پوش سرپلا کر بولا۔ ”خطوط میں تمہارے جوابے جوابے کر دوں گا۔ دو کروڑ کا انتظام کر دو۔ تمہارے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے اور پھر ابھی تمہیں پتہ نہیں لکھنے دن زندہ رہنا پڑے اور تمہاری لڑکی کا مستقبل....!“

”خبردار لڑکی کا نام نہ لینا۔“ ایک دروازے سے آواز آئی اور نوجوان ڈنکی ٹیل کا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں ریو اور تھا اور پھر اُس کے پیچھے بوڑھا ڈنکی ٹیل بھی نظر آیا۔ وہ بھی خالی ہاتھ نہیں تھا۔

”آن یہ چور پکڑا گیا۔ بڑی بات ہوئی۔“ بوڑھے نے ناقاب پوشوں کی طرف دیکھتے ہوئے سرپلا کر کہا۔ پھر اپنے بیٹھے سے بولا۔ ”تم دونوں کے نقاب اٹا رہو۔“

نوجوان ڈنکی ٹیل آگے بڑھا۔ انور اس باجرے کو حرثت سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھی کو دپڑے لیکن پھر اُس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بوڑھا ڈنکی ٹیل غیر معمولی قسم کے لباس میں تھا اور اُس کی چڑی کی بیٹھی سے ایک بہت بڑا تھیلا لٹک رہا تھا۔ دونوں نقاب پوش ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ نوجوان ڈنکی ٹیل نے بڑی تیزی سے انہیں بے نقاب کر دیا۔

”آہا.... سام....!“ بوڑھے نے کہا۔ ”میں سمجھا تھا شاید تم کر گیک ہو۔ اوسام گدھے۔ یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ میں ہوں۔ پچھلے سال سے میں نے روپوشی اختیار کر کھی تھی۔ یہ چور

”تمہارا بچا فرزند...!“ انور نے اردو میں کہا۔
 ”گٹ آؤٹ....!“ اُس نے روپا اور ہلاکر کہا۔
 ”انور....!“ فریدی نے اُسے مخاطب کیا۔ ”تم بہت دنوں سے میرے پیچھے رہے ہو۔“
 انور پہنچنے والا۔ وہ آگے بڑھ کر اکٹھڑیڈ کی لاش پر جھک گیا تھا۔
 ”زندہ ہے یا مر گیا؟“ فریدی نے لاپرواں سے پوچھا۔
 ”ٹھٹھا ہو چکا ہے....!“ انور نے جواب دیا۔
 ”فتح کا ہاتھ تھا کرمل۔“ فتح نے بچوں کے سے انداز میں خوش ہو کر کہا۔
 ”خاموش رہو۔“ فریدی نے اُسے جھڑک دیا اور بیگم ارشاد سے بولا۔ ”اگر تم بھی اپنے ہاتھ
 جھٹکریوں کے لئے پیش کرو تو بہتر ہے۔“
 ”تم ہوش میں ہو یا نہیں؟“ بیگم ارشاد پھر گئی۔
 ”تمہارے خطوط اور دوسرے کاغذات میرے پاس ہیں۔“ فریدی مسکرا کیا۔
 ”فتح نے وہ کاغذات ڈاکٹر ڈریڈ کے پاس سے اڑائے تھے اور پھر وہ میرے ہاتھ لگ گئے۔“
 بیگم ارشاد پہلے تو کھڑی ہانتی رہی پھر دوڑتی ہوئی ہال سے نکل گئی۔
 ”جمید اسے دیکھو۔“ فریدی نے دروازے کی طرف ہاتھ اختاک کر کہا۔ نوجوان ڈکنی میں بھی
 دوڑتا ہوا بارہ نکل گیا۔
 شاہینہ نے بھی اٹھنا چاہا لیکن فریدی نے کہا۔ ”تم جہاں ہو وہیں بیٹھی رہو گی۔“
 شاہینہ اس طرح بیٹھ گئی جیسے اُس کے پیروں میں کھڑے ہونے کی قوت ہی نہ ہو۔
 ”اُن کاغذات میں تم کیوں دلچسپی لے رہے تھے؟“ فریدی نے فتح سے پوچھا۔
 ”محض اس لئے کہ ڈریڈ بھی اُن میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں کئی سال سے اُسے ہر کام پر
 نکلت دیتا آیا ہوں۔ ایک دن وہ بھی تھا جب میری بچی کی لاش سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ میں
 لوگوں سے کہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پولیس اشیشن تک چلیں۔ لیکن وہ اس طرح خوفزدہ ہو کر
 پیچھے بہت جاتے تھے جیسے ڈریڈ انہیں بھی مار ڈالے گا۔ میں بڑی بے بُی سے روپا تھا۔ مگر آج،
 دیکھو.... وہ پڑا ہے ڈریڈ۔ ان چھوٹے چھوٹے نجیف ہاتھوں نے اُسے موت کی گھاث اتارا
 ہے.... ہاہاہا.... وہ بے لہس فتح کہاں ہے وہ اُس مظلوم بچی کے بعد ہی مر گیا تھا۔“
 ”خدا کے لئے مجھے بتائیے کرمل، یہ سب کیا ہو رہے ہے۔ ورنہ میرا دم نکل جائے گا۔“
 ”مجھے افسوس ہے شاہینہ وہ تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہ ہو گی۔“ فریدی نے جواب دیا۔

طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس کی نظر تھیلے پر پڑی جو ادھر ادھر اچھلا پھر رہا تھا اور وہ دنوں لڑ رہے
 تھے۔ شاہینہ اور بیگم ارشاد ایک دوسرے سے چھٹی ہوئی تھی طرح کانپ رہی تھیں۔
 پھر نہ جانے کیسے اُس تھیلے کا منہ کھل گیا اور وہ چھوٹا آدمی بچل کی سی سرعت سے دنوں
 لڑنے والوں کے درمیان آگیا۔
 پھر ایک بچہ ہال میں گون گئی۔ ایک آدمی دنوں ہاتھوں سے پیٹ پکلے ہوئے فرش پر ڈھیر
 ہو گیا تھا۔ نسخے آدمی نے چاقو ہاتھ سے چینک دیا اور اپنے دنوں ہاتھ اور اٹھاتا ہوا بوزھے ڈکنی
 ٹیل سے بولا۔ ”اب تم مجھے شوق سے حرast میں لے لو.... کرمل فریدی۔“
 ڈکنی ٹیل کاریو اور الہاتھ یعنی بچہ جھک گیا۔
 مرنے والے کا ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بوزھے ڈکنی ٹیل کو دیکھ رہا تھا۔ ہال میں تقریباً سمجھی
 بھونچے نظر آرہے تھے مگر زرد پوش مجھوں کی بیچھلی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی تھی۔
 ”تم نے اچھا نہیں کیا فتح....!“ ڈکنی ٹیل غلبیا۔
 ”میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کی سزا بھکتنے کو تیار ہوں۔“ چھوٹے آدمی نے کہا اور اسی
 طرح ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا حالانکہ اب ڈکنی ٹیل کاریو اور اس کی طرف نہیں اٹھا ہوا تھا۔ انور نے
 بھی اُس کی زبان سے کرمل فریدی کا نام سننا تھا اور سنانے میں آگیا تھا۔ اگر فریدی کا نام نہ سناتا تو
 اس قتل کے بعد بے بعد بے تھا شر فائزگ کرتا ہوا اندر گھس پڑتا۔ لیکن اُس نے نہایت اطمینان سے
 دروازہ کھولا اور ہال میں داخل ہو گیا۔
 نوجوان ڈکنی ٹیل سام کے ہتھلڑیاں لگا رہا تھا۔
 دفعتاً بیگم ارشاد کھڑی ہو گئی اور اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں بوزھے ڈکنی ٹیل کو مخاطب کیا۔
 ”کیا آپ بچھ ج کرمل فریدی ہیں؟“
 ”ہاں بیگم ارشاد... کیا تمہیں وہ رات یاد ہے جب کمپاؤٹ کے پھاٹک پڑھماری ملاقات ہوئی تھی۔“
 ”مجھے یاد ہے۔“
 ”اور تم اسی آدمی کی تلاش میں بھکتے رہنے کے بعد واپس آئی تھیں۔“ فریدی نے زرد پوش
 آدمی کی طرف اشارہ کیا جواب بھی پہلے ہی کی طرح کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا پھٹی آنکھوں
 سے اٹھیں دیکھ رہا تھا۔
 ”اوہ.... تو آپ بھی یہی کہانی لے کر آئے ہیں۔“ بیگم ارشاد نے مسکرانے کی کوشش کی۔
 دفعتاً نوجوان ڈکنی ٹیل نے انور کی طرف مڑ کر پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”چل بے خاموشی سے۔“ حمید پلٹ کر دہڑا۔ ”ورنہ گردن توڑوں گا۔“
پھر وہ جدھر بھی گئے انہیں کھڑکیوں اور دروازوں سے آگ کی لپیش دکھائی دیں۔ کپاڈ مٹ
میں لوگ چیز رہے تھے اور ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ پھر کچھ لوگ کسی نہ کسی طرح اندر گھے اور
انہوں نے شدید ترین جدو جہد کے بعد انہیں باہر نکالا۔

حمید نے باہر نکلتے ہی فریدی کو آوازیں دیں لیکن کہیں جواب نہ ملا۔ دفعتاً سے قریبی تھا نے
کے کچھ کا نشیبل نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک سب اسپکٹر بھی تھا۔ حمید نے جلدی جلدی اُسے
کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش کی اور قیدیوں کو اُس کے پرد کر کے اُس نے ایک بار پھر آگ میں
چھلانگ دی۔

”فریدی صاحب.... فریدی صاحب۔“ وہ چاروں طرف چختا پھر رہا تھا۔ اور آگ اب
آہستہ آہستہ اندر بھی اپنا تسلیم ہمانے گئی تھی۔

چیختے چیختے حمید کا حلق شنک بہو گیا لیکن جواب نہ ملا۔ وہ ایک ایسے کمرے میں پھنس گیا تھا
جہاں ہر طرف آگ کی لپیش نظر آ رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم پینے سے تر ہوا تھا اور ذہن
جواب دے رہا تھا۔ اچانک اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت دور سے اُسے آواز دے رہا ہو۔ اُس
نے ”ہاں“ کہنے کے لئے حلق پر زور دیا مگر آواز نہ نکل سکی۔ آگ میں گھرے ہونے کے باوجود
بھی اُس کے سامنے اب تاریکی ہتھی تھی۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کے منہ میں
جلتی ہوئی سلاخ ٹھوٹس رہا ہو۔

”اُم.... اُم.... نہیں۔“ وہ اچھل پڑا اور کوئی چیز فرش پر گر کر چھپھنائی۔
پھر اُس کی آنکھیں جیرت سے پھٹی رہ گئی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں تھا اور فریدی اس کی سہری
کے قریب بیٹھا ہوا شاید اُس کے حلق میں دوالتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”فادر....!“ حمید چکھاڑا کر اُس کی گردن سے چست گیا۔
”حید گدھے! میں بہت خفا ہوں تم سے۔ تم باہر نکل آنے کے بعد پھر اندر کیوں چلے گئے
تھے۔ میں تو نہایت آسانی سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ وہ نکل گیا تا سور۔“

”خچ نکل گیا۔“ حمید نے جیرت سے کہا۔
”ہاں.... وہ نکل گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے بندر پکڑنے کی مشق آج تک نہیں کی۔
اب کروں گا۔“
”مگر وہ مردود آپ کو پہچان گیا تھا۔“

شاہینہ اس طرح خاموش ہو گئی جیسے وہ کسی بڑی خبر کے سننے سے ڈرتی ہو۔ اور اُس نہیں سے
آدمی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

دفعتہ حمید دوڑتا ہوا اندر آیا۔

”اُس نے.... اُس نے.... عمارت میں آگ لگادی ہے۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”آگ تیزی
سے.... پھیل رہی ہے.... نہ جانے پڑوں کے کتنے میں الٹ دیے ہیں۔“

”کدھر.... آگ کس حصے میں ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”چاروں طرف...!“

”کیا کہتے ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اتنی جلدی؟“

”اوہ.... عمارت کے چاروں طرف دیوار سے ملی ہوئی تپی کی نالیاں ہیں۔ انہیں میں پڑوں
بہا کر اُس نے آگ لگادی ہے۔ آگ بہہ رہی ہے چاروں طرف۔“

”اوہ.... نکلو.... انور تم اس زرد لباس والے اور شاہینہ کو سنجھاؤ۔ حمید.... تم سام کو
دیکھو.... اور“ اُس نے فتح کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں کر کل شکریہ۔ میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔“ اُس نے ہاتھ چھڑانے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم قیدی ہو.... چلو....!“ فریدی غرایا۔

”ہاں.... میں قیدی ہوں لیکن اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاؤں تو مجھ سے زیادہ حق
ساری دنیا میں نہ ملے گا۔“

پھر فریدی کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی لیس دار چھلی ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ فتح اچھل کر بھاگا۔

”تم لوگ نکلنے کی فکر کرو.... جاؤ۔“ فریدی بیچہ لوگوں سے کہتا ہوا اُس کے پیچے دوڑا۔

حمدید کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ فریدی کو ایسی صورت میں تھا چھوڑ دے لیکن اُس پر خود اُسی
کیطرف سے ایک ذمہ داری عائد کرو گئی تھی۔ یعنی وہ سب کو صحیح و سلامت وہاں سے نکال لیجائے۔

وہ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ انہیں آجھ محسوس ہونے لگی اور اسی دوران میں انور نے یہ
بھی محسوس کیا کہ شاہینہ پر غشی طاری ہوتی جا رہی ہے۔ پھر اگر وہ اسے سنجھاں نہ لیتا تو اُسی کیسا تھ

خود بھی گرا ہوتا۔ بدقت تمام اُس نے اُسے کانہ سے پر ڈالا اور زرد پوش مجبول کا ہاتھ پکڑے
ہوئے چڑا رہا۔ لیکن اب اُس نے بھی بولنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دانت پر دانت جما نے کہہ رہا تھا۔

”اس لڑکی کو میرے کانہ سے پر ڈال دو.... کتنی چھوٹی ہے.... ہائے.... ہائے....“

”ہاں بعد میں پہچان لیا تھا۔ ورنہ پہلے تو وہ مجھے ڈاکٹر ذریثیہ سمجھا تھا۔ اسے چھوڑو۔ خدا کی پناہ! تمہیں وہاں اُس آگ سے نکالنے میں لکنی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ اگر مجھے ذرا سی ہی دیر ہو جاتی تو تم حید مسلم بن گنے ہوتے۔“

”مگر میں شاید بالکل ٹھیک ہوں۔“ حید بوکھلا کر اپنا جسم ثوالتا ہوا بولا۔
”بالکل.... لیکن میرے بیرون ڈکھو۔“

حید نے جھک کر دیکھا اور لرز گیا۔ اُس کے دونوں پیروں آبلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔
”میں سمجھا تھا شاید آپ کہیں گرے ہیں۔“ حید نے کہا۔... پچھدری خاموشی رہی پھر حید نے کہا۔ ”بیگم ارشاد میں تھی؟“
”ہاں.... لیکن کوئی نہ کھل میں۔ شاید اُس نے اپنے جسم پر بھی پڑوں چھڑک کر آگ لکائی تھی۔“

”لیکن اُس کا جرم کیا تھا؟“

”بہت بڑا جرم۔ مگر تھی بڑے گزدے کی عورت، زندگی بھر کوئی نہ کوئی اُسے بلیک میں ہی کرتا رہا تھا۔ وہ زرد پوش فرشتہ اس کیس کی اہم ترین کڑی تھا۔ تم بتاؤ وہ کون ہو سکتا ہے۔ بیگم ارشاد کو اس کی تلاش تھی اور ذریثیہ اس کے سلسلے میں اُسے بلیک میں کر رہا تھا۔“

”اس کا کوئی عاشق ہو گا۔“

”بہشت! وہ سر ارشاد کا لڑکا ہے۔ اوہ! تمہاری آنکھیں جیرت سے پھیل گئیں۔ ہاں حید صاحب بھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ وہ ایک ارب پتی کا لڑکا ہے۔ مگر گم ناہی اور عمرت کی زندگی بر کرتا رہا۔ اگر مجھے وہ نیلا یہیگ نہ ملتا تو شاید یہ کہانی پر دراز ہی میں رہتی۔ ارشاد کی دو یوں تھیں۔ ایک اُس لڑکے کی ماں اور ایک یہ جو جل کر مر گئی۔ یہ کسی معمولی آدمی کی مطلقہ تھی اور شاید در اصل اُسی آدمی کی لڑکی ہے۔ کسی طرح یہ ارشاد سے آنکھی اور اُس نے اس سے نکاح کر لیا۔ ارشاد کی پہلی یوں سے ایک پچھہ ہوا اور یام زیجی میں وہ کسی وجہ سے پاگل ہو گئی۔ ایک صبح ارشاد کو معلوم ہوا کہ یہو اور پچھے دونوں غائب ہیں حالانکہ دماغ ماؤف ہو جانے کے بعد سے پچھے اُس سے الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ غائب ہو گیا۔ دون بعده شہر کے ایک حصے میں مل گئی لیکن پچھے اُس کے ساتھ نہیں تھا لہذا خیال کیا گیا کہ ممکن ہے دیوالگی میں وہ اُسے کہیں پھیک آئی ہو۔ کافی عرصے تک پچھے کی تلاش جاری رہی۔ اس سلسلے میں جو اشتہارات شائع ہوئے ان میں اُس داغ کا حوالہ ضرور ہوتا تھا۔ جو ذریثیہ اُس کے بازو پر بیگم ارشاد کو دکھار رہا تھا۔ اب سنو! اُس کے پر یہ

گذری تھی کہ بیگم ارشاد نے اُسے اپنے کسی معتبر آدمی کے سپرد کر کے شاید مارڈا لئے کی اسکم بنائی تھی۔ لیکن اس معتبر آدمی نے اُسے دھوکا دیا۔ پچھے کو مارڈا لئے کی بجئے بروش کرڈا لیا اور زندگی بھر بیگم ارشاد کو بلیک میں کر کے لمبی لمبی رقبیں وصول کر تا رہا۔ اُس نے بلیک سے بیگم ارشاد کے خطوط بھی نکلے ہیں جن میں وہ بار بار اُس سے استدعا کرنی ہوئی نظر آتی ہے کہ وہ اُس لڑکے کو مارڈا لے اور اُس کے معاوضے میں وہ ایک کروڑ کی رقم تک جا پہنچتی ہے۔“

”مگر گاڑ....!“

”اور پھر نہ جانے کس طرح یہ زرد پوش فرشتہ ڈاکٹر ذریثیہ کے ہاتھ گلتا ہے اور اب وہ اُسے بلیک میں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ لڑکا مظہر عام پر آ جاتا تو بیگم ارشاد جیل میں ہوتی اور شایدیہ در در کی بھیک مانگتی پھر تی۔ اب کیا رہ گیا۔... ذریثیہ اور بیگم ارشاد کی وجہ سے دو باتیں شاید کبھی نہ معلوم ہو سکیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آدمی کون تھا جسے بیگم ارشاد نے پچھے کو مارڈا لئے پر آمادہ کیا تھا اور دوسرا یہ کہ ڈاکٹر ذریثیہ کو ان حالات کا علم کیسے ہوا تھا۔“

”ارے یہ تو زرد پوش فرشتہ ہی سے معلوم ہو جائے گا۔“

”مشکل ہے۔“ فریڈی نے مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”ذریثیہ کے زہروں نے اُس کا داماغ ماؤف کر دیا ہے۔ شاید وہ کبھی ٹھیک نہ ہو سکے۔ شاید اُسے اپنے قابو میں رکھنے کیلئے اُس نے ایسا کیا تھا۔“ ”ایسا وہ سر ارشاد کا لڑکا تھا۔ تھا کیا جائے گا؟ جبکہ اُس آدمی کا بھی پتہ نہیں جس نے اُس کی پرورش کی تھی۔ مگر ممکن ہے ان واقعات کا اعلان ہو جانے پر وہ خود ہی سامنے آجائے۔“

”سیا ذریثیہ نے اُسے زندہ چھوڑا ہو گا؟ ہرگز نہیں حید صاحب۔ یہ ثابت کرنا میرا کام ہے کہ وہ سر ارشاد کا لڑکا ہے۔“

”پچھدری تک خاموشی رہی پھر حید بولا۔“

”اُف.... فوہ! کتنے دنوں تک ہم ڈکی میل بن کر جھک مارتے رہے ہیں۔ بعض اوقات تو میں حق خود کو گدھے کی دم تصور کرنے لگتا تھا اور اُس دن تو گدھے کا پٹھا ہو گیا تھا جب شاید نے میرے گالوں پر تھپڑا مارے تھے۔ خدا کرے اُس کے ہاتھ میں کیڑے پڑیں۔“

”تم سے کس نے کہا تھا کہ اُس سے اظہار عشق کر بیٹھو۔“

”انور کا تودم ہی نکل گیا تھا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔“

”اُس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ورنہ اس بار ذریثیہ کا تھا آنا مشکل ہی ہو جاتا۔“

”مگر اس کو فتح نے ختم کیا۔“

”میں تو اسے کبھی ہاتھ نہ لگاتا۔ اسکیم یہ تھی کہ اُسے سام کے ہاتھوں ختم کراؤ۔ وہ مجرم جو خود کو بادشاہ سمجھتے ہیں انہیں میں غلاموں سے پتوانے کا عادی ہوں۔ اور فتح جیسے لوگوں کے لئے تھیلے تیار کرتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ذریثہ کا تعاقب کرتا ہوا وہاں ضرور پہنچے گا۔“

”مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا تھا کہ آج ذریثہ وہاں آ رہا ہے؟“

”مجھے اطلاع ملی تھی کہ اُس کے آدمی ارشاد منزل میں کچھ انتظامات کر رہے ہیں۔ انتظامات کی تفصیل سے صاف ظاہر تھا کہ آج وہاں ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔“

”کچھ دیر بعد حمید بولا۔ ”آہا... اُس کا کیا حال ہے؟... میری کا...!“

”وہ.... اُس کی ذہنی حالت ابھی تک اعتدال پر نہیں آئی۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ اُسے پاگل خانے بھجوادیا جائے۔“

حیدر ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ لیٹ گیا۔

اردو فینز ڈاٹ کام